عدد جزو ۱

شفیق الرحمن

مدّ و جزر

۳۸۲

مدّوجزر

شفیق الرحمٰن

مکتبہ جدید لاہور

دوسرا ایڈیشن

جنوری ۱۹۴۸ء

قیمت .... عہ/ ۸ر

اتحاد پریس مال روڈ لاہور میں باہتمام چودھری رشید احمد

چھپ کر مکتبہ جدید لاہور

سے شائع ہوئی

"س" کے نام ——!

غیروں سے کہا تم نے، غیروں سے سُنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سُنا ہوتا

فہرس

شریر پھول

اپنے بچپن کی جو جو باتیں مجھے یاد ہیں اُن سب میں نمایاں پھول ہیں، ابّا کا جہاں کہیں تبادلہ ہوتا وہیں باغوں میں گھری ہوئی کوٹھی ملتی، پھولوں سے پٹے ہوئے باغ جہاں درختوں سے زیادہ پھولدار پودے ہوتے، میں نے ہوش سنبھال کر سب سے پہلے دو چیزیں دیکھیں — امّی کا پُرشفقت چہرہ اور رنگ برنگے پھول، گلدانوں میں سجے ہوئے پھول، ننھّی کے بالوں میں لگے ہوئے پھول، انّا کے گلے میں پڑے ہوئے پھولوں کے ہار، حوض میں تیرتے ہوئے خوشبودار پھول، ابّا کی میز پر رکھے ہوئے پھولوں کے گچھے — گھر میں چاروں طرف پھول ہی پھول ہوتے۔ صحن تو پھولوں سے بھرا رہتا اور انّا مجھے پھولوں کے متعلق کہانیاں سنایا کرتی، اُس نے مجھے بتایا کہ

پھول بے جان نہیں ہوتے، یہ ہماری تمہاری طرح سانس لیتے ہیں، ہنستے ہیں، مسکراتے ہیں، بعض اوقات غمگین بھی ہو جاتے ہیں۔ اور سب سے زیادہ شریر گلاب کے پھول ہیں جن کا کام ہر وقت مسرور رہنا ہے، یہ دوسروں پر ہنستے رہتے ہیں، کسی کو اُداس دیکھا اور قہقہے لگانے لگے۔ گلِ اشرفی وہاں ہوتا ہے۔ جہاں زمین میں سونا ہی سونا ہو، رات کی رانی کے پھولوں کی کبھی سورج سے لڑائی ہو گئی تھی، چنانچہ اسی ضد میں وہ کبھی دن میں نہیں کھلتے ہمیشہ رات کو کھلتے ہیں۔ سورج مکھی کا پھول البتہ سورج پر عاشق ہے، لیکن سنا ہے کہ سورج اُس کی ذرا پروا نہیں کرتا، سورج پھولوں کو اچھا نہیں سمجھتا، ویسے وہ کسی نہ کسی پر عاشق ضرور ہے، جبھی تو ہر وقت جلتا رہتا ہے، لیکن سورج مکھی کو خواہ مخواہ کی غلط فہمی ہے۔ چنبیلی کے پھول بے حد غمگین رہتے ہیں، جب ہوا کے جھونکے چلتے ہیں تو یہ دبی دبی آہیں بھرتے ہیں، لیکن ان کی اُداسی کی وجہ کسی کو معلوم نہیں، نرگس کے پھول ہمیشہ کسی کے منتظر رہتے ہیں، کوئی ان سے ملنے کا وعدہ کر کے چلا گیا ہے۔ ابھی تک نہیں آیا یہی وجہ ہے کہ وہ دن رات منتظر رہتے ہیں۔ جہاں شبّو کی کلیاں ہوں وہاں رات کو پریاں اُترتی ہیں۔ اور رات بھر کھیلتی رہتی ہیں، کلیوں کو گدگداتی ہیں۔ اگر اتفاق سے کوئی ہنس دے تو وہ کھل کر پھول بن جاتی ہے، آسمان سے پریاں کسی کسی جگہ اُترتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شبّو کی کلیاں ہر جگہ نہیں ملتیں اور شبّو کے پھول تو قسمت ہی سے نظر آتے ہیں۔ صبح کے وقت جو ہوا چلتی ہے، وہ موتیے کی کلیوں کا منہ چومتی ہے اور کلیاں چٹک چٹک کر پھول بن جاتی ہیں۔

جو نکھار اور روپ صبح صبح موتیے کے پھولوں پر ہوتا ہے۔ چمن کے کسی پھول پر نہیں ہوتا۔ چھوئی موئی کی کلیاں بے حد شرمیلی ہیں، ہر وقت شرماتی رہتی ہیں۔ کوئی انہیں دیکھے یا نہ دیکھے، چھیڑے یا نہ چھیڑے، یہ بغیر کسی وجہ کے شرماتی رہتی ہیں۔ انّا ایسی بہت سی باتیں سنایا کرتی اور میں بڑے شوق سے سنتا۔ میں ہمیشہ پھولوں کو جاندار مخلوق سمجھتا رہا ہوں، بچپن میں میں اگر کسی کو پھول توڑتے دیکھتا تو میرا جی چاہتا کہ اس کا منہ نوچ لوں۔ ہر روز میں انّا سے لڑتا، وہ صبح صبح اتنے پھول توڑتی کہ سارا باغ خالی ہو جاتا۔ جب مجھے سکول سے فرصت ملتی سیدھا باغ میں جا پہنچتا، مالی بہتیرا منع کرتا، لیکن میں خود پھولوں کو سینچتا۔ ایک دن میں نے دیکھا کہ مالی ایک بڑی سی قینچی لیے پودوں کو تراش رہا ہے، رات کو میں چپکے سے اُس کی جھونپڑی میں گیا، قینچی چرالی۔ اور سامنے بہتی ہوئی ندی میں پھینک آیا۔

میں اُن دنوں پھولوں کو بے حد معصوم سمجھتا تھا، بالکل بھولے بھالے جنہیں کچھ بھی تو پتہ نہیں۔ لیکن میرا خیال غلط نکلا، پھول سیدھے سادھے ہرگز نہیں ہوتے، وہ انتہا سے زیادہ شریر ہوتے ہیں، سوائے شرارتوں کے اُن کا اور کوئی کام ہی نہیں، جب دیکھو کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔

وہ ہمارے پڑوس میں رہتی تھیں، دونوں کوٹھیاں ایک ہی احاطے میں تھیں اور دونوں کا ایک ہی باغ میں تھا۔ ہم دونوں کے کمرے بالکل آمنے سامنے تھے۔ تھوڑا سا فاصلہ تھا، ایک رات میری آنکھ کھلی اور میں کھڑکی میں جا کھڑا

ہؤا، میں نے دیکھا کہ باغ کے پتّے پتّے پر چاندنی ناچ رہی تھی، فضا میں خوشبو کا ایک طوفان آیا ہؤا تھا۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے اٹھکیلیاں کرتے پھر رہے تھے، وہ ایک ایسی دلفریب رات تھی جیسی خوابوں میں نظر آیا کرتی ہے۔ میری نگاہیں سامنے جم کر رہ گئیں، دونوں کمروں کے دریچے آمنے سامنے تھے، وہ سفید لباس پہنے خوابیدہ تھیں، تکیئے پر اُن کی لمبی لمبی زلفیں پریشان تھیں، اُن کے چہرے پر چاندنی کی کرنیں رقصاں تھیں، مری آنکھوں کے سامنے جیسے کسی سنگتراش کا شاہکار تھا، یا کسی مصوّر کی لاثانی تصویر، حسن جب خوابیدہ ہو تو اُس کی دلکشی کتنی گنا بڑھ جاتی ہے۔

میں نے ایک سفید گلاب کے پھول کو دیکھا جو کھڑکی سے جھانک رہا تھا ایک لمبی سی ٹہنی پر وہ پھول تنہا تھا۔ اور اس طرح جھکا ہؤا تھا جیسے اُن کے چہرے کو غور سے دیکھ رہا ہو، یہ پھول کھڑکی میں کہاں سے آ گیا؟ عین نیچے گلاب کا پودا تھا اور یہ پھول غالباً ابھی کھلا تھا۔ ہوا کا جھونکا آیا اور پھول آگے بڑھا —— اُن کے چہرے کی طرف بالکل نزدیک پہنچ کر واپس آ گیا، ایک اور جھونکا آیا اور پھول جھوم کر اُن کے ہونٹوں کے قریب پہنچ گیا۔ جیسے انہیں چومنا چاہتا ہو۔ میں ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ کیا واقعی ہوا چل رہی ہے یا یہ پھول شرارت کر رہا ہے؟ میں نے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر دیکھا، ہوا بالکل بند تھی۔ پھول پھر جھکا، اس مرتبہ اُس نے ہونٹوں کو بس چھو ہی لیا، لیکن فوراً واپس آ گیا۔ میں نے سر باہر نکال کر چاند کو دیکھا جو بڑی تیزی سے چمک رہا تھا۔ آسمان پر نہ دھند تھی نہ کوئی بدلی، پھول جھوما، آگے جھکا، جھکتا گیا، جھکتا گیا، حتےٰ کہ اُس

نے وہ ہونٹ چوم لیے ـــــ اُن کے یاقوتی ہونٹ سچ مچ چُوم لیے

کل صبح اسے ضرور توڑ دوں گا۔ چاندنی یکلخت پھیکی پڑ گئی، چاند نے اپنا چہرہ ایک ننھی سی بدلی کے پیچھے چھپا لیا تھا۔ مجھے بھی رات بھر نیند نہ آئی، میں وہیں کھڑا رہا، ذرا ذرا دیر کے بعد پھُول چھوتا اور اُن کے ہونٹ چوم لیتا، جب چاند درختوں کے پیچھے چلا گیا، ستارے ٹمٹمانے لگے اور آسمان پر ہلکی ہلکی سفید روشنی پھیلنے لگی۔ تب ایک ننھی سی چڑیا کہیں سے اُڑ کر آگئی۔ دریچے میں اُس کے رنگین پر بہت پیارے معلوم ہو رہے تھے۔ اُس نے نہایت دلکش سروں میں ایک نغمہ چھیڑا، اور اپنے چہچہوں سے انہیں جگا دیا، جب انہوں نے مسکرا کر کروٹ لی تو پھول پیچھے ہٹ گیا۔

صبح کے وقت میں نے دیکھا تو کھڑکی کے سامنے ایک سرخ گلاب کا پھول مسکرا رہا تھا، لیکن رات کو یہ سفید تھا ـــــ یہ سرخی اس نے کہاں سے چرالی؟ ـــــ اُن کے ہونٹوں سے؟ یا یہ شرما شرما کر سرخ ہو گیا ہے ـــــ شریر کہیں کا۔

وہ بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں، چاروں طرف پھولوں کے تختے تھے! انہوں نے نہایت خوشنما لباس پہن رکھا تھا، ایسا رنگین لباس جسے دیکھ کر پھول بھی آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے، اُن رنگوں میں وہ اتنی حسین معلوم ہو رہی تھیں کہ پھولوں کی طرف دیکھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ وہ ہر دفعہ بیڈمنٹن کی چڑیا کو اتنے زور سے مارتیں کہ وہ پھولوں میں جا گرتی اور اُن کی مخالف دوڑ کر اٹھا لاتی۔ چاروں طرف پھول گم سم کھڑے تھے، اتنے میں اُن کی مخالف نے ان

کی طرف زور سے چڑیا پھینکی جسے وہ کھیل نہ سکیں، چڑیا پھولوں میں جا گری۔ وہ اٹھانے کو لپکیں اور پھولوں میں ہل چل مچ گئی۔ چڑیا گیندے کے پھولوں میں گری تھی۔ وہ کچھ اس انداز سے جھومے کہ چڑیا اچھل کر نرگس کے پھولوں میں جا الجھی، انہوں نے شرارتاً اُسے اچھال دیا، گلاب کے پھول پہلے ہی منتظر تھے انہوں نے اشارہ کیا اور ایک ٹہنی نے جھوم کر چڑیا گلاب کے پھولوں میں الجھا دی۔ انہوں نے پہلے تو ہاتھ بڑھا کر چاہا کہ اُسے پکڑ لیں، لیکن وہ اُن کی پہنچ سے دور چلی گئی تھی، جب وہ آہستہ آہستہ پودوں سے بچتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں تو پھول اچھل اچھل کر اُن کے دامن کو چومنے کی کوشش کر رہے تھے، چند کانٹوں نے اُن کے دوپٹے کو تھام لیا، انہوں نے اپنی لمبی لمبی سفید اُنگلیوں سے ٹہنیوں کو ہٹایا اور جونہی چڑیا کو پکڑنے لگیں ایک پھول نے کلنٹے کو آنکھ ماردی، کانٹا اُن کی اُنگلی میں چبھ گیا۔ اُف کر کے وہ پیچھے ہٹیں، اور گلاب کے پھول مسکرا مسکرا کر جھومنے لگے، اُنہیں دیکھ کر سارے پھول لہک اُٹھے، اور وہی پھول جو ابھی گم سم کھڑے تھے، جھوم جھوم کر قہقہے لگانے لگے۔

باغ میں ایک بادام کا درخت بھی تھا، اُس میں شگوفے پھوٹے، سُوکھی سوکھی ٹہنیوں پر گلابی کلیوں نے وہ سماں باندھا کہ سارے باغ میں وہ درخت نمایاں ہوگیا۔ دوپہر کا وقت تھا، وہ کتاب ہاتھ میں لیے باہر نکلیں، شاید باغ میں بیٹھ کر مطالعہ کرنا چاہتی تھیں، اُنہوں نے اُسی حسین درخت کو منتخب کیا، اُس کے

سائے میں بیٹھ گئیں، ابھی ایک دو صفحے ہی پڑھے ہوں گے کہ ایک کلی ٹہنی سے ٹوٹی پتّوں سے اُلجھتی ہوئی اُن کی گود میں آگری۔ انہوں نے اُسے اٹھا لیا، سونگھا اور کتاب میں رکھ لیا، فوراً ہی دوسری کلی آگری، پھر تیسری، ــــــ غرضیکہ کلیاں اسی امید میں گرنے لگیں کہ شاید وہ انہیں اٹھا اٹھا کر اپنی گود میں رکھتی جائیں گی، اُنہوں نے اُوپر دیکھا، چہرے پر مسکراہٹ اور غصّہ ملے جلے سے تھے۔ اتنے میں تیزی سے ایک کلی سیدھی اُن کے لبوں پر آکر گری، لب چوم کر گود میں گر گئی۔ پھر جو کلیوں کی بارش شروع ہوئی ہے تو وہ پریشان ہو گئیں، انہوں نے دوپٹے سے سر کو اچھی طرح ڈھانپ لیا، کتاب سے سر پر سایہ کر لیا لیکن کلیاں بے تحاشا گرتی گئیں، حتےٰ کہ وہ وہاں سے اُٹھ کھڑی ہوئیں اور واپس اپنے کمرے میں چلی گئیں، وہاں پہنچ کر انہوں نے پردے سے جھانک کر دیکھا۔ کلیوں کی بارش ختم ہو چکی تھی اور درخت خاموش کھڑا تھا۔

میں باغ میں اُن کا انتظار کر رہا تھا، زندگی میں آج پہلی مرتبہ میرا نصیبہ جاگا تھا، انہوں نے رات کو باغ میں ملنے کا وعدہ کیا تھا، اور مجھے یقین ہی نہ آتا تھا کہ وہ آئیں گی، میں نے بچّوں کی طرح ضد کی تھی، جب انہوں نے آنے کا وعدہ کیا تو میں نے فرمائشوں کی بوچھاڑ کر دی، آپ ضرور وہ چمکیلے تاروں جیسے آویزے پہن کر آئیں گی، میری محبوب خوشبو لگا کر، میرا پسندیدہ گلابی ملبوس پہن کر، لٹوں کو دونوں شانوں پر پریشان کر کے، غرضیکہ عجیب عجیب فرمائشیں کی تھیں اور ضد بھی کی تھی۔ وہ کہنے لگیں اگر گلابی لباس رات کو پہنا تو امّی باز پرس

کریں گی، لیکن میں مچل گیا۔

میں پھولوں میں گھرا ہوا بیٹھا تھا، بار بار گھڑی کو دیکھتا اور پھر چاند کو۔ چاند بڑی تیزی سے درختوں کی چوٹیوں کو عبور کرتا ہوا جا رہا تھا۔ گیارہ بج چکے تھے، اب ایک گھنٹے تک چاند غروب ہو جائے گا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ چاندنی میں آؤں گی، دیر ہرگز نہ ہو گی۔ اور اب چاند غروب ہوا چاہتا ہے، اگر اندھیرا ہو گیا تو میں اُن کا چہرہ اچھی طرح نہ دیکھ سکوں گا۔ بالکل میرے قریب ایک غنچہ چپ چاپ ٹہنی پر جھکا ہوا تھا، میں نے بے صبر ہو کر اُس سے پوچھا۔ کیا وہ آئیں گی؟ غنچے نے آہستہ سے جنبش کی، میں نے پھر سرگوشیوں میں پوچھا۔۔۔ سچ بتا کیا وہ آئیں گی؟ غنچہ لہرایا، اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کہہ رہا ہو کہ ہاں آئیں گی — لیکن کب آئیں گی؟

چاند کچھ دیر میں غروب ہو جائے گا۔ میں آج چاندنی میں اُن کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔

میں اپنے ہونٹ غنچے کے نزدیک لے گیا، اور پھر پوچھا — یوں نہیں اگر بتانا ہے تو اچھی طرح بتا، اس جنبش سے کام نہیں چلے گا، کسی طرح صاف صاف کہہ دے، پھر میں نے سوچا یہ کیا احمقوں کی سی باتیں کر رہا ہوں، غنچے بھی کبھی بولے ہیں، واقعی میں احمق ہوں جبھی تو اتنی رات گئے ایسی جگہ منتظر بیٹھا ہوں، اور پھر انتظار بھی اُن کا کر رہا ہوں، جن کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے چاند رات بھر بے چین رہتا ہے، دریچوں سے، کھڑکیوں سے ٹہنیوں سے، غرضیکہ جہاں سے اُسے موقعہ ملے گھورتا رہتا ہے۔ مجھے حسن سے عنایات کی

توقع ہے، بھلا حسن اگر مہربان ہو جائے تو وہ حسن کیسا، حسن اور غرور ہمیشہ ساتھ ساتھ ہیں۔ انہیں کیا ضرورت ہے جو ایسے وقت چل کر مجھے ملنے آئیں اور مجھ میں ہے ہی کیا، لیکن انہوں نے وعدہ جو کیا تھا — افوہ! بارہ بجنے والے ہیں، اور چاند درختوں کے جھنڈ میں جا رہا ہے۔ اب اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے گا — یہ کیسی آہٹ ہے؟ — یہ کون آیا؟ — میرا دل دھڑکنے لگا — نہیں! — کوئی نہیں! ہوا کا جھونکا تھا۔ اب وہ نہیں آئیں گی — ہرگز نہیں آئیں گی — اور وہ غنچہ کہاں گیا؟ جو دیکھتا ہوں تو میرے سامنے غنچے کی جگہ ایک پھول مسکرا رہا ہے — مگر وہ غنچہ کہاں ہے؟ میں نے اُسے تلاش کیا لیکن وہ نہ ملا کہیں وہ کھل کر پھول تو نہیں بن گیا؟ — یہی ٹہنی تو تھی، یہ وہی ہے، ابھی ابھی کھلا ہے، کھل کر اس نے اشارہ تو کر دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ضرور آئیں گی، میں نے پھول سے کہا — دیکھ اگر واقعی وہ آگئیں تو تجھے اُن کے بالوں میں سجاؤں گا۔ پھول نے اپنی پنکھڑیاں پھیلا دیں، اب وہ ایک مکمل اور شگفتہ پھول بن چکا تھا۔

چپکے سے چاند درختوں کے پیچھے چلا گیا، اور تاریکی پھیل گئی،
آسمان پر ظلمت چھا گئی، آس پاس کھڑے ہوئے درخت
نہایت مہیب دکھائی دینے لگے، چاروں طرف ایک وحشت سی برسنے لگی،

"چاند غروب ہو چکا" میں نے شکوہ کیا۔

اُنہوں نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔ اور چاروں طرف اجالا ہی اجالا تھا، ستارے

بڑی تیزی سے چمکنے لگے، کہیں سے ایک عجیب سی روشنی آ کر فضا میں پھیل گئی، اُن کی آنکھیں کسی ملکوتی نور سے روشن تھیں، اُن کے آویزوں میں دو ستارے چمک رہے تھے، اُن کے دوپٹے کا سنہرا پلّو ــــ اور پھر اُن کا دمکتا ہوا چہرہ۔ اتنی روشنی تھی کہ میں چاند اور اُس کی چاندنی کو بھول گیا۔

جب میں نے اُن رسیلے سُرخ ہونٹوں کو نزدیک سے دیکھا تب مجھے محسوس ہوا کہ اُس رات اُس شریر پھول نے انہیں چوم کر بڑی گستاخی کی تھی۔ میں نے اپنے سامنے کھلے ہوئے پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ اُسے توڑ کر اُنکے بالوں میں سجادوں۔ لیکن پھول پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے پھر ہاتھ بڑھایا۔ وہ پھر جھوم کر پرے چلا گیا۔ یہ شریر ہوا کے جھونکوں کے بغیر کیونکر جھُوم رہا ہے؟ اس مرتبہ میں اسے ضرور توڑ لوں گا۔ میں نے آگے جھک کر ہاتھ بڑھایا اور وہ پتوں میں جا چھپا۔

"آپ کیا تلاش کر رہے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"ابھی ابھی یہاں ایک پھول تھا جسے میں نے آپ کی زلفوں کے لئے چُنا تھا"

اور جب انہوں نے ہاتھ بڑھایا تو نہ جانے وہ پھول کہاں سے تڑپ کر نکلا سامنے آیا اور اُن کی انگلیوں سے خود بخود چھو گیا۔ ذرا سی دیر میں وہی پھول اُن کی زلفوں میں آویزاں تھا۔ جب میں نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ شریر کہیں کا۔

احمق

دیکھنے میں وہ احمق بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات تو بڑا سمجھدار اور ذہین دکھائی دیتا۔ لوگ اُسے بڑا اچھا لڑکا سمجھتے تھے۔ ویسے بھی وہ بُرا نہیں تھا۔ تعلیم میں ہشیار تھا۔ آداب آتے تھے، سارے کھیل اچھی طرح کھیل لیتا تھا۔ اُس کی باتیں بڑی دلچسپ تھیں شکل وصورت میں بھی اچھا خاصا تھا۔ لیکن پھر بھی کچھ کچھ احمق ضرور تھا۔ اُس کی حماقتوں کا پتہ یا تو اُس کے دوستوں کو چلتا اور یا اُن کو جو بڑے غور سے اُس کی حرکات کا مطالعہ کرتے رہے ہوں۔

وہ خود بھی جانتا تھا کہ میں صبح سے شام تک نری حماقتیں کر رہا ہوں۔ لیکن یہ اُس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ حماقتیں کرنا اُس کی عادت ہو گئی تھی۔ وہ ہمیشہ لمبے سے لمبے راستہ سے کالج جایا کرتا۔ جو اصل راستہ سے کئی گنا لمبا ہوتا

اور اُسے اس میں بڑا لطف آتا۔ اتوار کو جب وہ اپنے دوست کے ساتھ موٹر سائیکل پر جاتا تو پیچھے اس طرح بیٹھتا کہ اُس کا منہ دوسری طرف ہوتا۔ اور راستے میں جو دیکھتا وہی مسکرا دیتا۔ سینما جاتا تو ہمیشہ سیکنڈ شو میں اور بالکل اکیلا اور ہمیشہ ایسی پکچر میں جاتا، جہاں کوئی بھی نہ ہوتا۔ بعض اوقات وہ بارش میں اچھا سا سوٹ پہن کر بغیر چھتری کے سیر کو نکل جاتا، اور اچھی طرح بھیگ کر بڑے مزے سے چہل قدمی کرتا ہوا واپس آجاتا۔ لڑکوں میں وہ کافی پسند کیا جاتا تھا، اور اُس کی حماقتوں کے باوجود اُس کے بہت سے مداح تھے۔ چند ایک لڑکیاں بھی اُسے بہت اچھا سمجھتی تھیں۔ اور ایک کو تو وہ بہت ہی عزیز تھا۔

وہ بیوقوف بھی نہیں تھا۔ بس یونہی جان بوجھ کر حماقتیں کرتا رہتا، اس امید پر کہ شاید اُن کے نتائج بڑے اچھے نکلیں۔ لیکن یہ اُسے پتہ تھا۔ کہ حماقتیں آخر حماقتیں ہی ہوتی ہیں اور حماقتیں ہی رہتی ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ مجبور تھا اور یہ اُس کی عادت ہو گئی تھی۔

اُس کا دل بالکل صاف تھا، آئینے کی طرح، اُس نے کبھی کسی کی بُرائی نہیں کی۔ نہ کبھی بُرائی سوچی، یہاں تک کہ جب کبھی کوئی اُسے بُرا بھلا کہتا تو وہ فوراً معاف کر دیتا۔ اور دل پر اتنا سا میل نہ آنے دیتا۔ وہ فوراً دوسروں پر یقین کر لیتا۔ اِسی لئے اکثر لوگ اُسے دھوکہ دے جاتے۔ اور جب کوئی عزیز دوست اُسے دھوکہ دیتا تو اُسے بہت ہی افسوس ہوتا اور اُس کا دل کٹنے لگتا کئی گہرے دوست تو اُس کی حماقتوں سے تنگ آکر اُس سے کترانے لگے تھے بعض اوقات اُسے یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کا کوئی دوست نہیں رہا۔

ایک روز اُسے اتفاق سے ایک خط مل گیا۔ جو ایک خاتون نے کسی اور خاتون کو لکھا تھا۔ اُس خط میں اُس کی حماقتوں کا ذکر تھا۔ اور اُسے بیوقوف کہا گیا تھا۔ وہ خط نہایت ہی تلخ تھا۔ اُسے بڑا افسوس ہوا۔ کئی مرتبہ اُس کی آنکھوں میں آنسو بھی آئے۔

اور لطف یہ تھا کہ اُنہی دنوں اُسے ایک اور لڑکی کا خط ملا۔ جو اُسے بہت اچھا سمجھتی تھی اور جس کی یہ کچھ زیادہ پروا نہیں کرتا تھا خط میں اُس کی بے حد تعریفیں کی گئی تھیں۔ اُسے وجیہہ، جاذبِ نظر، ہنس مکھ، عقلمند اور نہ جانے کیا کیا کہا گیا تھا۔ وہ کتنے دنوں تک یہی سوچتا رہا کہ ان دونوں خطوط میں سے کون سا صحیح ہے اور کون سا غلط۔ آخر نتیجہ یہی نکلا کہ وہی خط صحیح ہے جس میں اُسے بے وقوف لکھا گیا تھا۔

پھر ایک دن اُس نے ناہید کو دیکھ لیا، اور اُس کی دنیا ہی بدل گئی۔ طرح طرح کی مسرتیں اُس کی زندگی میں آ گئیں۔ وہ ہر وقت مسرور رہنے لگا۔ پہلے اُس کے خیالات بالکل منتشر رہتے تھے۔ لیکن اب وہ محض ناہید کے متعلق ہی سوچتا رہتا تھا، پہلے اُس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ تھا اور اب ناہید ہی اُس کی آرزو تھی۔ وہ ہی اُس کی جستجو تھی۔

جب اُس نے ناہید کو پہلی مرتبہ دیکھا تو اُسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی پرانے بچھڑے ہوئے رفیق کو ڈھونڈ لیا ہو۔ اس کے بعد عجیب سے حادثے شروع ہو گئے۔ تقریباً ہر ہفتے ناہید کہیں نہ کہیں اُسے دکھائی دے جاتی۔ اور یہ اُسے

بے وقوفوں کی طرح دیکھتا رہتا۔ پھر اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ناہید کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے ایک دوست سے ملنے کئی میل دور گیا۔ اور دفعتاً اُسے معلوم ہوا کہ ناہید اُن کے پڑوس میں رہتی ہے۔ اُن کے مکان کی چھت سے اُس کی نگاہ دوسری کوٹھی کے باغ میں چلی گئی جہاں ناہید بیٹھی کچھ پڑھ رہی اُس روز اس نے جی بھر کر ناہید کو دیکھا

نہایت ہی پیاری گڑیا سی لگ رہی تھی۔ اس کے بعد ناہید کو شاید پتہ چل گیا کہ کوئی اُسے دیکھ رہا ہے۔ اُس کے گال بالکل سرخ ہو گئے۔ اور جب اُس نے اوپر دیکھا اور نظریں چار ہوئیں تو یہ ایسا بے اوسان ہوا کہ بُری طرح وہاں سے بھاگا۔

پھر ایک اور اتفاق ہوا۔ یہ اتوار کو اپنے عزیزوں سے ملنے گیا۔ وہاں کوئی خاتون اپنی سہیلی سے ملنے جا رہی تھیں، یہ اُن کے ساتھ انہیں چھوڑنے گیا۔ اور وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ یہ تو ناہید کا گھر ہے۔ اور اس کی مسرت کی کوئی حد نہ رہی جب یہ ڈرائنگ روم میں صوفے پر اکیلا بیٹھا تھا تو اُسے ایک عجیب سا احساس ہوا جیسے ناہید اسے دیکھ رہی ہے۔ ویسے ایک کواڑ تھوڑا سا کھلا ہوا بھی تھا۔ اور شاید وہاں کوئی کھڑا بھی تھا۔ اور اس خیال سے اس کا دل بُری طرح دھڑکنے لگا اور دیر تک دھڑکتا رہا۔

چلتے وقت یہ ایک رسالہ وہیں چھوڑ آیا جس پر اس کا نام لکھا ہوا تھا۔ وہ ہفتہ اُسے گذارنا مشکل ہو گیا۔ دن رات، صبح شام، چوبیس گھنٹے اسے ناہید کا خبط ہو گیا تھا۔ ہر روز وہ اپنے دوست سے ملنے اتنی دور جاتا۔ کسی بہانے چھت پر تو پہنچ جاتا۔ لیکن نیچے دیکھنے کی ہمت نہ پڑتی۔

پھر اتوار آیا اور وہ اپنے عزیزوں کے ہاں گیا، اور انہی خاتون کے ساتھ دوبارہ ناہید کے گھر گیا، وہ تو اندر چلی گئیں اور اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا۔ اُس نے دیکھا کہ وہی رسالہ ایک کونے میں زمین پر پڑا تھا۔ اُس نے اٹھا لیا۔ اور جب وہ ورق گردانی کر رہا تھا تو اُس نے دیکھا کہ اُس میں ایک تصویر رکھی ہے — ناہید کی تصویر۔ اس کے بعد اُسے ہوش نہیں رہا کہ کتنی دیر وہ وہاں بیٹھا رہا اور کیا سوچتا رہا۔

جب وہ واپس آ رہا تھا تو اسے محسوس ہوا جیسے بلندیوں میں پرواز کر رہا ہو اس قدر مسرور شاید وہ زندگی میں کبھی نہ ہوا تھا۔ سارا دن وہ تصویر کو دیکھتا رہا۔ حتےٰ کہ اُسے ایک ایک خدوخال زبانی یاد ہو گیا۔ اُس نے سوچا اب ایک نئی زندگی شروع ہو رہی ہے۔ محبت کی زندگی، جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی اور وہ نہایت ہی خوش قسمت ہے۔ وہ دن بدن ہنس مکھ اور اچھا لڑکا بنتا جا رہا تھا۔ لیکن اُس کی حماقتیں بدستور تھیں۔ بلکہ پہلے سے کچھ زیادہ ہی ہو گئی تھیں۔ اکثر وہ ایسے رستوں پر ناہید کا انتظار کرتا جہاں اُس کا گزر ہی نہ تھا۔ وہ دریا پر جا کر کشتی چلاتا رہتا اور صبح سے شام تک اُسے ناہید کا انتظار رہتا، وہ اس پر دل ہی دل میں ہنستا بھی کہ بھلا اتنی دور ناہید کیونکر آئے گی؟ پھر اُسے خیال آتا کہ شاید اتفاق سے وہ ادھر سے گذرتی ہوئی آ جائے۔ حادثے بھی تو ہوتے ہی رہتے ہیں، اُسے کسی خوشگوار حادثے کی اُمید تھی۔

ایک اور فضول سا خبط اُسے ہو گیا تھا۔ نہ جانے یہ کیوں اُس کے ذہن میں بیٹھ گیا۔ کہ ناہید اُسے خط لکھے گی۔ کسی نہ کسی روز ایک ہلکا پھلکا نیا سا معطر لفافہ

آئے گا۔ جس میں ایک محبت بھرا خط ہوگا۔ چنانچہ ہر وقت اُسے ناہید کے خط کا انتظار رہنے لگا۔ جو خط اُس کے نام آتا اُسے ناہید کا خط دکھائی دیتا۔

ہر وقت وہ ناہید کے خواب دیکھتا تھا۔ رات کو بھی اور دن کو بھی۔

ہاں! ایک کام اُس نے عقلمندی کا کیا تھا۔ جو چند ایک لڑکیاں اُسے پسند کرتی تھیں۔ اُن سے وہ بے رُخی برتنے لگا۔ یہاں تک کہ چند دنوں کے بعد مکمل طور پہ دوستی ختم ہو گئی۔ کیونکہ اب ناہید ہی اُس کے لئے سب کچھ تھی اُس کا دل اس کے خیالات اُس کی روح ــــ سب کچھ ناہید کے تھے۔

لیکن ایک لڑکی صوفیہ تھی۔ کہ مانتی ہی نہ تھی۔ دونوں پرانے واقف تھے بھلا اتنی پرانی اور مخلص دوستی صوفیہ کیونکر ختم کر سکتی تھی۔ آخر تنگ آ کر اس نے صوفیہ کو صاف صاف کہدیا۔ ناہید کے متعلق۔ صوفیہ پھر بھی نہ مانی، اور بولی ــ "یہ میں جانتی ہوں کہ مجھے آپ کی محبت نہیں مل سکتی۔ لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ ایسی دیرینہ رفاقت کو یکلخت چھوڑ دوں۔" لیکن اُس نے ایک نہ سنی۔ اس نے سوچا کہ اب کسی اور لڑکی سے ملنا ایک قسم کی خیانت ہے۔ صوفیہ سے بگاڑنے پر اُسے افسوس ضرور تھا۔ لیکن اس وقت ناہید اُسے دنیا میں سب سے زیادہ پیاری تھی۔ آخر اُس نے صوفیہ سے کہدیا کہ آئندہ کبھی نہیں ملیں گے۔ اور وہ سیدھی سی لڑکی چپ چاپ چلی گئی اور پھر کبھی نہ آئی۔

عید سے ایک روز پہلے وہ اپنے اُسی دوست کے ہاں مدعو تھا۔ جب شام ہوئی تو کسی بہانے سے چھت پر چلا گیا، اُس نے دیکھا کہ نیچے باغ میں ناہید کھڑی چاند دیکھ رہی تھی۔

جب اُسے چاند نظر آیا تو اُس نے فوراً ناہید کا چہرہ دیکھا۔ اُس کے خیال میں یہ نیک شگون تھا۔ ناہید ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی تھی اُس کے ہاتھ بھی آسمان کی جانب اُٹھ گئے اور اس نے بڑے خلوص سے دعا مانگی کہ

"اے پیارے خدا ہم دونوں علیحدہ علیحدہ جا رہے ہیں۔ ہمارے راستے بھی دور دور ہیں۔ ہماری ایک ہی منزل ہو جائے۔ ہم اکٹھے یہ سفر طے کریں۔ ہم ایک دوسرے کے رفیق ہو جائیں۔ اس وقت ہم دونوں کی نگاہیں عید کے چاند پر ہیں۔ ہم آئندہ عید کا چاند اکٹھے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر دیکھیں۔ اب وہ خوشگوار حادثے شروع ہو جائیں۔ جن کا مجھے اتنی دیر سے انتظار ہے۔ اور ہم ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں"

اُس نے ناہید کو دیکھا وہ بھی دعا مانگ رہی تھی ـــــ شاید وہ بھی یہی دعا مانگ رہی ہو۔ کیونکہ جب ناہید کے خیال سے وہ اتنے دنوں سے بے چین ہے اتنی دعائیں اس نے مانگی ہیں۔ اپنی نگاہوں سے سب کچھ کہہ ڈالا ہے۔ تو بھلا اُسے اس کا خیال کیوں نہ ہو گا۔ ضرور وہ بھی یہی دعا مانگ رہی ہے

اس خیال نے اس کی روح پر ایک عجیب سا سرور طاری کر دیا جب وہ نیچے اُترا تو اس کے دل میں بے شمار امنگیں تھیں، امیدیں تھیں، آرزوئیں تھیں، اور اُس کے دل میں ایک ہل چل مچی ہوئی اور اُسے یقین تھا کہ آج کی دعا ضرور مقبول ہو گی۔

اگلے روز عید تھی، نہ جانے اُسے کیا ہو گیا، وہ نہایت ہی اداس تھا، بے حد غمگین اُس نے اپنا کمرہ بند کر لیا اور سارا دن اندر بیٹھا رہا۔ حالانکہ دوستوں

کے ساتھ اُس نے کئی پروگرام بنائے ہوئے تھے، لیکن وہ کہیں نہ گیا چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے ناہید کی موہنی مورت تھی۔ آج اس نے پیارا پیارا لباس پہنا ہو گا۔ چمکیلا اور بہت خوشنما لباس، اُس کے چہرے پر ایک معصوم سی مسکراہٹ ہو گی، جگمگاہٹ ہو گی۔ انوکھا روپ ہو گا۔ وہ ایک پیاری سی گڑیا دکھائی دے رہی ہو گی، اُن بڑی بڑی آنکھوں میں نرالا سحر ہو گا۔

پھر جیسے اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک خوشنما محل پھرنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہؤا جیسے یہ اُس کا گھر ہے۔ اور وہ تھکا ہارا واپس لوٹ رہا ہے سامنے سنگِ مرمر کے ستونوں میں اُس نے دیکھا کہ ناہید کھڑی ہے، اُسی لباس میں اور اسی روپ میں جو اُس کے تخیّل میں بس رہا تھا۔ وہ اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے دیکھ کر وہ مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے، وہ بیحد مسرور تھا

اور جب وہ اپنے خوابوں سے چونکا تو شام ہو چکی تھی، اُس کا جی چاہا کہ کسی دوست سے مل آؤں، پھر اُس نے سوچا کہ آج میں بہت اُداس ہوں اور اُداسی کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس لئے وہ کمرے میں ہی بیٹھا رہا۔ اور اسی طرح دن گذرتے گئے۔ اُس کے دل میں ناہید کی محبّت جڑ پکڑتی گئی۔ اور وہ بدستور حادثوں کا منتظر رہا۔ پھر ایسا اتفاق ہؤا کہ وہ کئی مہینوں تک ناہید کو نہ دیکھ سکا۔ ایک روز اُس کے دل نے بغاوت بھی کی۔ وہ ایک شام کو دریا میں کشتی چلا رہا تھا۔ جب وہ کشتی کو کنارے لگا کر ریت پر بیٹھا غروب آفتاب

دیکھ رہا تھا۔ تب ایک عجیب سی اُداسی اُس کے دل میں اُترتی گئی۔ اور اُس کی روح کو جیسے تاریکی نے ڈھانپ لیا۔ اُس کے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ اتنے میں چاند نکل آیا ــــ چودھویں کا چاند۔ اور وہ چاند کی طرف دیکھنے لگا۔ ناہید کو دیکھے کئی مہینے گذر گئے تھے، اس عرصے میں اُس نے پوری پوری کوشش کی تھی۔ کہ کہیں اُس کی ایک جھلک ہی نظر آجائے۔ اور جو وہ اب کبھی نظر نہ آئے پھر؟ ــــ یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ کوئی ضروری تو نہیں کہ اس کے پریشان خوابوں کی تعبیر اچھی ہی نکلے۔ اور یہ محبت بھی کیسی بے معنی سی تھی۔ نہ کبھی ناہید سے بات کی تھی نہ کچھ، بس خود ہی وہ اس آگ میں پھنکتا رہا تھا۔ کیسی عجیب بات تھی۔ اگر کوئی سنے تو ہنس ہی پڑے۔ وہ بہت دیر تک یونہی بیٹھا سوچتا رہا۔ دریا کی شفاف سطح پر چاند کا عکس پڑ رہا تھا۔ زرد رنگ کا بڑا سا عکس ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ چاند کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اب یہ کتنا بڑا ہے کل سے گھٹنا شروع ہو جائے گا۔ اور پھر ایک دن غائب ہو جائے گا پھر یہ ایک سا طلوع ہو گا۔ اسی طرح یہ سلسلہ قائم رہتا ہے یہ سب کچھ مقررہ ہے لیکن یہ سب کچھ کس قدر بے معنی ہے یہ چاند اور اس کا عکس دونوں بے معنی ہیں۔ اور یہ جو کچھ میں سوچتا رہا ہوں وہ کس قدر بے معنی ہے۔

یہی چاند تب بھی چمک رہا تھا۔ جب میں نے ناہید کو پہلی مرتبہ دیکھا بالکل ایسا ہی پورا اور بڑا سا چاند تھا۔ اُس کے بعد میں نے کیسی کیسی دعائیں مانگیں کیسے کیسے جتن کئے لیکن اب تک ناہید مجھ سے اتنی ہی دور ہے جتنے یہ چاند اور ستارے۔ اُس نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈال دیا اور لہروں سے کھیلنے لگا ــــ اُس نے سوچا یہ دریا ہمیشہ چپ چاپ بہتا رہتا ہے۔ اب یہ سمندر

میں جاگرے گا۔ پھر وہی پانی آسمان سے برسے گا اور شاید اسی دریا میں بہنے لگے گا کتنی بے معنی سی بات ہے؟ یہ سب کچھ کس قدر فضول لگتا ہے۔ یہ ستارے رات بھر کیوں ٹمٹماتے رہتے ہیں؟ کس کے لئے؟ اور ہر رات کتنے ٹوٹتے ہیں پھر بھی اُتنے کے اُتنے ہیں۔ یہ دن رات، صبح و شام اس قدر پھیکے اور بے رنگ و بُو کیوں ہیں؟ قدرت اس قدر لاپرواکیوں ہے؟ جہاں بے شمار پھُول کھلتے ہیں۔ وہیں لاتعداد کلیاں مرجھاتی ہیں۔ جو امید قدرت دل میں تخلیق کرتی ہے۔ اُسی کو خود نابود کیوں کر دیتی ہے؟ کیا یہ خلوص اور دعائیں سب بیکار ہیں؟ اور محبت کیسی فضول چیز ہے۔ اس میں ہم ہمیشہ وہ کچھ سوچتے ہیں جو ہمارے سامنے نہیں ہوتا۔ ہمیشہ غیر ممکن باتوں کے متعلق سوچتے ہیں — ایسی باتوں کے متعلق جو نہ ہو سکتی ہیں، اور نہ ہوں گی۔ اور محبت میں انسان کس قدر بے وقوف اور احمق بن جاتا ہے۔ اور اُسے سب کچھ رنگین نظر آتا ہے۔ حالانکہ یہاں ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ راستہ ہے — ہر ایک کا تنہا راستہ ہے۔ جسے بالکل اکیلے طے کرنا ہے۔ کوئی کسی کا رفیق نہیں۔

تب اُسے سب کچھ بے معنی دکھائی دینے لگا۔ یہ چاند، یہ تارے، یہ زمین یہ آسمان، یہ بہتا ہؤا دریا سب کچھ۔ یہ کیسی دنیا ہے؟ یہ کیسی خدائی ہے؟ اور میں ہمیشہ دیوانہ سا کیوں رہتا ہوں؟ کھویا کھویا سا کیوں رہتا ہوں؟ مجھے اس قدر خواب کیوں دکھائی دیتے ہیں؟ رات کو اور دن کو بھی۔

وہ کشتی میں بیٹھ گیا۔ اور اُسے پانی کے بہاؤ میں چھوڑ دیا۔ تب اُس نے عہد کیا کہ آئندہ کبھی بھی ناہید کے متعلق نہیں سوچے گا۔ وہ شاید اسے جانتی بھی نہ

ہو۔ اُس کے لیئے یہ بالکل اجنبی ہے۔ اور دل کیا ہے۔ جس طرح چاہا بہلا لیا۔

کئی دنوں تک وہ یہی کوشش کرتا رہا کہ ناہید کے متعلق نہ سوچے۔ وہ اس میں کچھ کامیاب تو ہوا۔ لیکن غمگین سا ہو گیا، دوستوں سے کترانے لگا۔ اکثر تنہا گوشوں میں افسردہ بیٹھا رہتا۔

ایک شام کو وہ پکچر دیکھ رہا تھا، اچانک اُس کی نگاہیں دائیں طرف چلی گئیں۔ اُس کے سامنے بجلی سی کوند گئی۔ سانس جہاں تھا وہیں رہ گیا۔ وہاں ناہید بیٹھی تھی۔ اپنی امّی اور بہنوں کے ساتھ۔ اور بے خبری میں سگرٹ اُس کی انگلیوں سے گر گیا۔

کچھ دیر میں وہ سنبھل گیا، اُس نے ڈرتے ڈرتے دزدیدہ نگاہوں سے اُس طرف دیکھا۔ ناہید اُس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اُن نشیلی آنکھوں کا فسوں، گلاب کی پنکھڑی جیسے لبوں کی معصوم سی مسکراہٹ، گالوں کے دو ننھے سے گڑھے۔ اُس بھولے بھالے چہرے سے جیسے شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اُس کی نگاہیں واپس آگئیں۔ اُس کا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ بار بار وہ اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں اُس نے پھر ناہید کو دیکھا۔ جو اس مرتبہ پھر اُس کی جانب ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ کوئی اس قدر حسین و جمیل بھی ہو سکتا ہے جتنی ناہید ہے؟ اُس نے بیشمار خوبصورت چہرے دیکھے تھے۔ لیکن اس چہرے میں کئی ایسی باتیں تھیں جو اس نے آج تک نہ دیکھی تھیں اور جنہیں وہ بیان بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک عجیب سا خیال

اُس کے دل میں آیا۔ کاش کسی روز وہ اور ناہید پکچر دیکھنے آجائیں۔ اسی جگہ اور یہیں اکٹھے بیٹھے دیکھ رہے ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے۔ اُس روز وہ اپنا سیاہ سوٹ پہن کر آئے گا۔ سیاہ بو لگا کر۔ ناہید کے ساتھ بیٹھنے میں عجب شان ہو گی۔ تب ناہید بھی چمکیلا سیاہ لباس پہن کر آئے گی۔ جس میں اُس کا گلابی چہرہ یوں جگمگ جگمگ کریگا۔ کہ نگاہیں خیرہ ہو جائیں گی۔ دفعتاً اُسے ایک اور خیال آیا— کہ یہ میں کیسی احمقانہ باتیں سوچ رہا ہوں۔ بھلا یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کبھی؟ ہے نا حماقت سراسر؟ لیکن حماقتیں اُس کے لئے نئی نہیں تھیں۔ چنانچہ وہ بدستور اسی قسم کی باتیں سوچتا رہا اور دل ہی دل میں وہ باتیں دہراتا رہا۔ جو وہ اُس روز ناہید سے کریگا۔

جب پکچر ختم ہوئی تو جیسے اُس کا خواب ختم ہو گیا۔

آہستہ آہستہ ہال خالی ہو رہا تھا۔ لیکن وہ بدستور کھڑا رہا۔ جب ناہید جا رہی تھی۔ تو اُس کا رومال گر پڑا۔ اور اُس نے جلدی سے لپک کر اٹھا لیا۔ سوچا کہ دوڑ کر دے آؤں۔ پھر خیال آیا کہ شاید میرے لئے ہی ناہید نے یہ رومال گرایا ہو یہ ایک نہایت احمقانہ خیال تھا۔ لیکن اُسے یقین ہو گیا۔ کہ واقعی یہ رومال اُس کے لئے ہی گرایا گیا تھا۔ رومال کے ایک کونے پر ناہید کا نام لکھا تھا۔ وہ پیارہ کا نام جو صرف کنبے والے ہی جانتے تھے۔ وہ دیر تک اُسی نام کو دیکھتا رہا، وہاں کبھی ناہید کی لمبی لمبی سفید انگلیاں بھی چھو گئی ہونگی۔

اور جب وہ واپس آرہا تھا تو اُس نے عہد کر لیا کہ آئندہ کبھی کوئی عہد نہیں کرونگا۔ اب تو ناہید کا رومال اُسے مل گیا تھا۔ جو اُس نے خود اُسے دیا تھا

اُس نے اپنے دل کو ڈانٹ دیا۔ کہ خبردار جو آئندہ ناہید کے خلاف کچھ بھی سوچا تو

رات کو اُس نے ناہید کو خواب میں دیکھا ایک ملکہ کے روپ میں جس کا ہاتھ اس نے اپنی آنکھوں سے لگا لیا، اور اُس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دیر تک ناہید کی وہی تصویر دیکھتا رہا۔ جو اُسے دی گئی تھی۔ اور جو ہمیشہ اُس کے سرہانے رکھی رہتی تھی۔ پھر وہ باغ میں چلا گیا۔ حالانکہ اُن دنوں اندھیری راتیں تھیں۔ پھر بھی نہ جانے کیوں وہ باغ میں چلا گیا، وہاں اُس نے دیکھا کہ لمبے لمبے سرو کے درختوں کے پیچھے چاند طلوع ہو رہا تھا۔ آسمان کے اُس حصّے میں بڑی روشنی ہو رہی تھی۔ اور درختوں کے ایک جھنڈ پر چند تارے بڑی تیزی سے چمک رہے تھے۔ سرو کے سیاہ درخت بہت بھلے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ گھاس پر بیٹھ گیا۔ جو اوس سے گیلی تھی۔ اور چاند کا انتظار کرنے لگا۔ جو پتّوں اور ٹہنیوں کی اوٹ میں چپکے چپکے طلوع ہو رہا تھا۔ اُس کے دل و دماغ میں ناہید بسی ہوئی تھی۔ وہ اُسی کو یاد کر رہا تھا۔ شاید ناہید بھی اپنے باغ میں اسی طرح گھاس پر بیٹھی چاند کی منتظر ہو اور شاید اسے یاد کر رہی ہو۔ اور شاید کسی روز وہ اور ناہید بالکل ایسی ہی رات کو اکٹھے بیٹھے چاند کو طلوع ہوتے دیکھ سکیں۔ اور جب ایسے رنگین لمحات آئے تو وہ ناہید سے بہت سی باتیں کریگا۔ پہلے تو وہ اُسے اپنے سارے خواب سنائے گا۔ اس کے بعد وہ ناہید سے ان نظاروں کا ذکر کریگا۔ جو اُس نے تنہا دیکھے تھے۔ وہ اُن برفانی چوٹیوں کی باتیں بتائے گا۔ جو درختوں کے جھنڈ میں سے اُبھرتی ہوئی آسمان سے جا ملتی ہیں۔ جنہیں چاند اور ستاروں کے راز معلوم ہیں، جو گذرتے ہوئے بادلوں سے سرگوشیاں کرتی رہتی

ہیں۔ اور اُن درختوں پر ایک سفید سی دھند چھائی رہتی ہے۔ پھر وہ اُن لیدے پھندے کنجوں کی باتیں کرے گا۔ جو دائیں بائیں، اُوپر نیچے، ہر طرف رنگ برنگے پھولوں سے پٹے پڑے ہیں۔ جہاں کی سنہری دھوپ میں پھول دل کھول کر ہنستے ہیں، اور طرح طرح کے رنگوں سے نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ جہاں چاندنی رات میں ہوا کے جھونکے طرح طرح کی خوشبوئیں پھیلاتے ہیں۔ جہاں چاند کی کرنوں کے ساتھ پریاں اُترتی ہیں۔ اور ساری رات کھیل کر صبح کی سفیدی سے پہلے واپس چلی جاتی ہیں۔ پھر وہ اُن صحراؤں کا ذکر کرے گا۔ جہاں ریت کے سنہری ٹیلوں پر کارواں گذرتے ہیں، جہاں ایسی ایسی آندھیاں آتی ہیں۔ کہ دن اور رات میں تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ اُن صحراؤں کی وسعت میں ایک عجیب سا فسوں ہے۔ ایک ہیبت ہے بعض اوقات تو وہاں ناشاد روحوں کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ جہاں جھلسے ہوئے درخت ہمیشہ آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ شاید گھٹاؤں کی امید میں جو صرف سرسبز جگہ ہی برستی ہیں اور وہاں کبھی نہیں آئیں۔

اسی طرح وہ اُسے تمام نظارے بتائے گا جو اُس نے تنہا دیکھے تھے پھر اپنی گذشتہ زندگی کی باتیں کرے گا۔ کہ اب تک وہ کس قدر تنہا رہا ہے قہقہوں میں اُس کے آنسو نکل آیا کرتے تھے چاروں طرف ویرانی ہی ویرانی تھی۔

اس کے بعد وہ ناہید کے ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا کر سورج، چاند اور تاروں کی قسم کھا کر کہے گا۔ کہ وہ اُس کی رُوح ہے۔ اُس کی زندگی ہے، دنیا کی سب سے عزیز ترین شے ہے۔ اور اُس کے جینے کے لئے ناہید کی رفاقت بہت ہی ضروری ہے۔

بس وہ اسی طرح کی باتیں دیر تک سوچتا رہا۔ صبح تک۔

اُس کا آخری امتحان ہوا اور وہ کامیاب ہو گیا۔ اُسے فوراً دوسری جگہ بلایا گیا۔ لیکن وہ چاہتا تھا۔ کہ ابھی وہیں رہے۔ اگر اُسے پہلے پتہ ہوتا تو وہ فیل ہی ہو جاتا۔ کیونکہ ابھی تو سب کچھ نامکمل تھا۔ جو خواب وہ دیکھ رہا تھا۔ اُن کی تعبیر باقی تھی۔ چمکیلے دن تو ابھی آنے والے تھے۔ چنانچہ بڑی سوچ بچار کے بعد اُس نے کچھ ایسا انتظام کیا جس سے چند ماہ وہ اور وہیں ٹھہر سکتا تھا۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ ہوا۔ مصیبت یہ تھی کہ اُس نے یہ بات بالکل پوشیدہ رکھی تھی۔ اپنے گھر سے دوستوں سے بھی۔ ناہید کے گھر میں اُس کی کسی نہ کسی طرح رسائی ہو سکتی تھی۔ لیکن وہ جہاں اس قدر احمق تھا۔ وہاں خوددار بھی تھا۔ اور کسی کی مدد نہیں لینا چاہتا تھا۔ اُدھر دن تھے کہ ایک ایک کر کے گذر رہے تھے۔ آخر وہ مقررہ وقت بھی ختم ہو گیا۔ اور اُس کے جانے میں محض چند روز باقی رہ گئے۔

اب وہ کچھ نڈر سا ہو گیا۔ دفعتاً نہ جانے اُسے کیا سوجھی۔ وہ ایک خوبصورت سی سنہری انگوٹھی لایا۔ جس میں بڑا پیارا نگینہ جڑا ہوا تھا۔ اُس نے پختہ ارادہ کر لیا کہ چلتے وقت کسی نہ کسی طریقے سے یہ انگوٹھی ضرور ناہید کو دے دیگا۔ اُس کے ساتھ ہی اُس نے اپنی اچھی سی تصویر نکالی اور ان دونوں چیزوں کو ایک کتاب میں رکھ دیا۔

اتوار کو وہ اپنے عزیزوں کے ہاں گیا اور کئی بہانوں سے اُن خاتون کو ناہید کے ہاں لے جانے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں وہ نظریں بچا کر بڑی دلیری سے ناہید کے کمرے میں گیا اور سنگھار میز کی دراز میں وہ کتاب رکھ آیا۔ جب وہ واپس

لوٹا۔ تو بڑا مطمئن تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ انگوٹھی معمولی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ میرا دل لپٹا ہوا ہے۔ میں نے اپنی روح کی پیشکش کی ہے۔

اور جب وہ جانے لگا تو اُس نے کسی کو خبر تک نہ ہونے دی کہ وہ جا رہا ہے، ہاں کسی طریقے سے ناہید تک یہ بات پہنچا دی۔ اُس نے اپنے دوستوں سے کچھ نہ کہا۔ کیونکہ اُسے امید تھی۔ کہ شاید ناہید مل جائے۔ یا کچھ کہلوا بھیجے۔ پہلے تو اُس کا ارادہ ہوا کہ اپنے اُسی دوست کے ہاں جلدی سے جائے شاید وہیں کہیں راستے میں ناہید نظر آ جائے، لیکن کچھ سوچ کر وہ اپنے کمرے ہی میں بیٹھ گیا۔ نہ جانے کس چیز نے اُسے یقین دلا دیا کہ آج اُس کی قسمت چمکے گی اور وہ خوشگوار حادثہ ضرور ہوگا جس کا اُسے اتنے دنوں سے انتظار تھا۔ اُس کا دل کہتا تھا۔ کہ آج ناہید اور وہ ضرور ملیں گے۔ وہ بڑی بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ حتےٰ کہ شام ہو گئی۔ اور وہ چپ چاپ سٹیشن چل دیا۔ راستے میں بھی وہ چاروں طرف ناہید کو ڈھونڈتا گیا۔ ٹرین میں بیٹھ کر بھی اُس کی امید بدستور قائم تھی۔ ناہید کا انتظار بدستور تھا۔ لیکن جب ٹرین چلنے لگی تب اُس نے سوچا کہ وہ اپنی عزیز ترین شے کو چھوڑ کر جا رہا ہے۔ اس سرزمین کو بھی جس سے ایسی حسین اور دلکش یادیں وابستہ ہیں۔ جہاں قسمت ایسے ایسے دلچسپ حادثات لائی، جہاں اُس کی روح کے ویرانے میں چپکے سے بہار آ گئی۔ اور اب یہ سب کچھ چھوڑتے وقت اُسے کس قدر رنج ہو رہا تھا۔ نہ جانے کیا چیز اُس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھی نشتر چبھو رہی تھی۔ ایک بھیانک تاریکی چاروں طرف چھا رہی تھی۔ اُس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ دم گھٹتا جا رہا تھا۔

وہ خزاں کی ایک اُداس شام تھی، سہ پہر سے آندھی چل رہی تھی۔ بگولے اُٹھ رہے تھے۔ سوکھے پتے ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔

چاروں طرف جیسے درد برس رہا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور اتنا روئے کہ جی ہلکا ہو جائے۔

لیکن وہ سنبھل گیا۔ اُس نے سوچا یہ سب میری اپنی اداسی ہے۔ جو ہر چیز میں جھلک رہی ہے۔ یہ میرے دل کی ویرانی ہے۔ میری غمگین روح کی وحشت ہے۔ ورنہ یہ شام ایک معمولی سی شام ہے، ہر روز سورج ڈوبتا ہے آندھیاں آتی ہیں، بگولے اُٹھتے ہیں۔ بہار کے بعد خزاں بھی آتی ہے بھلا اس میں نئی بات کون سی ہے۔

مجھے اُداس نہیں ہونا چاہیئے، ہرگز رنجیدہ نہیں ہونا چاہیئے جس کی معصوم محبت نے میرے دل کو طرح طرح کی مسرتوں سے بھر دیا۔ اُس کی ناشکری تو مجھ سے ہرگز نہ ہوگی۔ میں دیوانہ سا، آوارہ سا، ہمیشہ پریشان رہا کرتا تھا۔ ایک دن ناہید میری زندگی میں آنکلی اور سب کچھ بدل گیا، اور مجھے ایک نئی زندگی مل گئی ــــ محبت کی زندگی جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔

اور اب میں جا رہا ہوں تو کیا ہوا۔ نہ جانے قسمت کب مہربان ہو جائے اور چند خوشگوار حادثے ہمیں ایک دوسرے کے قریب لے آئیں۔ وہی قسمت جو ناہید کو میری زندگی میں اچانک لے آئی۔ کیا پتہ وہی ہمیں ایک دوسرے کا رفیق بنا دے شاید بہت جلد مجھے ایک معطر لفافہ مل جائے جس میں ناہید کا محبت بھرا خط ہو۔

اور وہ انگوٹھی جس کے ساتھ میرا دل لپٹا ہؤا ہے ــــ جو ناہید اُسے اپنی لمبی سی سفید اُنگلی میں پہن لے تو؟ اور شاید وہ پہن ہی لے۔ پھر وہ میری تصویر؟ ــــ کیا پتہ کسی روز ناہید کے البم میں لگی ہوئی ہو ــــ ناہید کی تصویروں کے ساتھ۔

اُس نے آنسو پونچھ ڈالے اور مسکرانے لگا۔

اور جب ٹرین جا رہی تھی۔ تب بھی وہ کھڑکی سے اسی امید میں جھانک رہا تھا۔ کہ شاید کہیں ناہید نظر آ جائے۔

عین اُسی وقت چند میل پرے ناہید اپنے کمرے میں بیٹھی اپنی ننھی سی گھڑی کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ اُس کے پیارے چہرے پر نہ اضطراب تھا نہ بے چینی، بلکہ ایک عجیب سی بے پروائی تھی۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ ٹرین چلی گئی ہو گی۔ تب وہ اُٹھی۔ ایک مرتبہ گھڑی کو پھر دیکھا ــــ اور بولی "شکر ہے کہ جناب چلے گئے" پھر اُس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی لٹیں سنواریں، دوپٹہ درست کیا، اور خوشبو کے لئے دراز جو کھولی تو اُس میں سے وہی کتاب نکلی۔ صفحہ اُلٹا، نام پڑھا، کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ دریچہ کھولا، کتاب باہر پھینکنے لگی تھی کہ پھر کچھ خیال آ گیا اور واپس لوٹ آئی۔ انگوٹھی کتاب سے نکل کر دریچے کے نیچے کہیں باغ میں جا گری۔ اُس نے مسکراتے ہوئے کتاب کو الماری کے پیچھے پھینک دیا۔

اتنے میں اُس کی سہیلی آ گئی بولی۔ "بہت کھلی پڑتی ہو آج۔"

"ہاں" وہ بولی۔ "نہ جانے بعض اوقات کوئی خواہ مخواہ کیوں احمق بن جاتا ہے، اور پھر جو حماقتیں کرتا ہے تو بس ــــ بالکل حماقتیں ہی حماقتیں ــــ سراسر

حماقتیں ___ افوہ!"

"کون کرتا تھا حماقتیں؟ ___ کیسی حماقتیں؟؟"

"پتہ نہیں" ___ وہ ہنسنے لگی ___!

اور وہ دونوں تاش کھیلنے لگیں۔

پھر اُس کی سہیلی بولی "آؤ ذرا ہمارے گھر تک تو چلو، کہو تو بیگم سے اجازت لے لوں۔"

ناہید پہلے تو تیار ہو گئی۔ پھر اُس نے دریچے کے پاس آ کر دیکھا تو آندھی چل رہی تھی۔ خشک پتے ہوا کے جھکڑوں کے ساتھ اُڑ رہے تھے۔

وہ بولی "نہیں آج نہیں۔ یہ شام بڑی اُداس اور ویران ہے۔ یہ آندھی بگولے اور خزاں سب کچھ بہت بھیانک ہے۔ مجھے ویرانی سے بڑا ڈر لگتا ہے۔"

اور وہ دونوں پھر تاش کھیلنے لگیں۔ اُس وقت ناہید کا چہرہ بجلی کی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ اور وہ اِس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی۔ کہ اگر وہاں کچھ پروانے ہوتے تو شاید اُس کے چہرے کا طواف کرنے لگتے۔

کبھی کبھار کمرہ قہقہوں سے گونج اُٹھتا تھا۔ ناہید کے چہرے پر نہ اضطراب تھا، نہ بے چینی۔ اب وہ طنز بھری مسکراہٹ بھی آہستہ آہستہ غائب ہو رہی تھی۔

اور اُس دریچے کے نیچے بیشمار سوکھی ہوئی ٹہنیوں اور پتّوں میں وہ انگوٹھی پڑی تھی۔ جس کے چھوٹے سے نگینے میں کسی کی روح سمائی ہوئی تھی۔ کسی کا دل مقیّد تھا۔

آندھی کے تیز جھکڑ چل رہے تھے۔ انگوٹھی پر بے شمار خشک پتے گرتے گئے حتےٰ کہ وہ بالکل دفن ہو گئی۔

دُعا

بعض اوقات ہمارے دل میں یہ خیال بار بار آتا ہے کہ ہم دعا کیوں مانگتے ہیں، ہماری خواہشیں، ہمارے خیالات، ہمارے دل و دماغ — کیا چیز ہے جو خدا سے پوشیدہ ہے، جو کچھ ہم سوچتے ہیں خدا جانتا ہے، اُس کے سامنے ہماری آنکھیں دو آئینے ہیں جن میں ہمارے سارے خیالات منعکس ہیں، اور اگر یہ صحیح ہے تو جو پیغام ہم اپنے دل کے ذریعے پہنچا سکتے ہیں اُسے زبان پر کیوں لائیں؟ زبان پر لانے سے اثر جاتا رہتا ہے۔ وہ بات نہیں رہتی، ہمارے خیالات اور اُن کے اظہار میں زمین و آسمان کا فرق ہے، بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ہم دن میں کتنی مرتبہ سوچتے ہیں۔ لیکن اُن کا اظہار نہیں کر سکتے۔ اگر ہم اُنہیں الفاظ میں منتقل کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

یا تو یہ ہو کہ ہماری دعائیں بے حد مختصر ہوں اور بے غرض ہوں۔ بس ہم خدا کو یاد کر لیا کریں۔ اُس کی نعمتوں کا شکریہ اور اُس کی عظمت اور اُس کے جلال کا اعتراف کر کے دعا ختم کر دیں یا ہمیں چاہیئے کہ ہم دوسروں کے لئے دعائیں مانگیں اور ہماری دعاؤں میں تنگی اور خود غرضی نہ ہو بلکہ وسعت ہو، فراخدلی ہو۔

لیکن ہم عجیب و غریب دعائیں مانگتے ہیں، اگر کوئی پاس کھڑا سُن رہا ہو تو ہنس ہنس کر دوہرا ہو جائے۔ ہماری دعاؤں میں مستقل مزاجی نام کو نہیں ہوتی۔ آج ہم فلاں چیز مانگ رہے ہیں اور چند دنوں کے بعد کسی معمولی سے واقعہ سے متاثر ہو کر ہم اُسی چیز سے دُور رہنے کے لئے دعائیں مانگتے ہیں، ایک گھر میں رہنے والے دو بھائی مختلف دعائیں مانگتے ہیں، ایک چاہتا ہے کہ آج بارش نہ ہو، یہ بادل صاف گذر جائیں کیونکہ آج میچ نہیں ہو سکے گا، دوسرا چاہتا ہے کہ آج خوب موسلا دھار بارش ہو۔ کیونکہ وہ اپنی منگیتر کے ہاں جا رہا ہے۔ اور اگر بارش ہوئی تو سارا دن وہاں گذار سکے گا۔

اُدھر خدا کو اپنے سب بندوں سے ایک جیسی محبت ہے، اُسے کتنی مشکل پڑتی ہو گی، کسے خوش کرے اور کسے ناراض۔

لیکن یہ دیکھا ہے کہ اکثر ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں، ہم دن میں سینکڑوں مرتبہ بھی دعائیں مانگیں تب بھی کوئی نہیں سنتا۔ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو ہم مانگتے ہیں۔ وہ درحقیقت ہمارے لئے بُرا ہوتا ہے اور خدا جان بوجھ کر ہماری درخواست رد کر دیتا ہے، اور ہمیں اس کا احساس دیر میں ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ ہم خوب شور و غل مچا کر، خوب گڑگڑا کر دعا مانگتے ہیں لیکن وہ الفاظ حلق سے نکلتے رہتے ہیں۔ دل سے نہیں نکلتے۔ دل کہیں اور ہوتا ہے۔ اگر ہم کوشش بھی کریں تب بھی دل ساتھ نہیں دیتا۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے۔

اور اُن دعاؤں کے ساتھ وہ دعائیں بھی رائگاں جاتی ہیں۔ جو ہم خلوص دل سے مانگتے ہیں، اِدھر اُدھر بھٹک کر رہ جاتی ہیں۔

لیکن ان سب کے باوجود دعاؤں میں میرا عقیدہ ہے۔ بعض دعائیں قبول بھی ہوتی ہیں، خواہ ہم منہ سے ایک لفظ نہ نکالیں، ہمارے ہونٹ خاموش رہیں ہم دل ہی دل میں خدا سے سب کچھ کہدیں، اور خدا سن لیتا ہے۔

میں بہت کم دعا مانگتا ہوں، جب کبھی مجھے یہ خیال آتا ہے، ایک واقعہ مجھے یاد آجاتا ہے، دعا کا خیال اور اس واقعے کی یاد آپس میں اس قدر گھل مل گئے ہیں۔ کہ اب میں انہیں جدا نہیں کر سکتا۔ اپنی سیاحت کی جس قدر یادیں میرے دل میں محفوظ ہیں۔ یہ اُن میں سے ایک ہے۔

جن دنوں کا یہ ذکر ہے اُن دنوں سخت سردیاں تھیں اور میں سی۔ پی کے جنگلوں میں گھوم رہا تھا۔ اچانک ایک جگہ ایک مانوس سا نام سنا۔ پوچھا تو معلوم ہوا کہ اس نام کے ایک ڈاکٹر ہیں۔ نزدیک ہی ہیں۔ پندرہ بیس میل پیدل سفر تھا۔ شام کو وہاں پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب سے میری یونہی سی واقفیت تھی۔ جن دنوں میں کالج میں داخل ہوا وہ اپنے آخری امتحان کی تیاری کر رہے تھے، اب وہ ایک سنجیدہ اور مدبر شخص تھے، اور چند بچوں کے والد تھے۔ انہوں نے مجھے ٹھہرا لیا، دن بھر مصروفیتوں میں گذرتا۔ سیر سپاٹے اور شکار۔ رات تھک کر سو جاتا۔ وہاں سے پانچ چھ میل پرے ایک نواب صاحب رہتے تھے دراصل وہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ ڈاکٹر صاحب جس قصبے میں رہتے تھے وہ اُس ریاست کا سب سے بڑا قصبہ تھا۔ لیکن نواب صاحب نے اپنا محل

ایک اونچی سی پہاڑی پر بڑی خوشنما جگہ بنوایا تھا۔ محل کے آس پاس کوئی آبادی نہ تھی۔ نواب صاحب کی تعریفیں سُن سُن کر میرا اشتیاق بڑھتا گیا کہ کسی طرح اُن سے ملوں۔ پھر معلوم ہوا کہ اُن کا محل اس قدر خوبصورت ہے کہ جو ایک مرتبہ دیکھ لے وہاں سے ملنے کو اُس کا جی نہیں چاہتا، اور بھی ایسی ایسی بہت سی باتیں سنیں، لیکن کوئی موقعہ نہ مل سکا۔ ایک شام کو ہم تھکے تھکائے واپس آئے اور فوراً سو گئے، رات کوئی دو تین بجے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا، معلوم ہوا کہ نواب صاحب کے صاحبزادے سخت بیمار ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب کو بلایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب صبح بھی وہاں گئے تھے اور ملاحظہ کر کے دوائیاں دے آئے تھے، لڑکے کو نمونیہ تھا اُنہوں نے مجھے بتایا کہ لڑکے کی حالت تشویشناک نہیں ہے، دراصل وہ لوگ گھبرائے ہوئے ہیں۔ اسی لئے بار بار بلاتے ہیں۔ میں نے اُن سے اجازت مانگی کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو اُن کی جگہ میں چلا جاؤں، مجھے اُن لوگوں سے ملنے کا بیحد شوق ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اجازت دے دی، باہر اندھیرا تھا اور بڑے زوروں سے بارش ہو رہی تھی۔ میں برساتی پہن کر ساتھ ہو لیا۔ جنگل کا پیچیدہ راستہ ہوا کے تیز جھونکے، بارش، ہم بہت دیر میں وہاں پہنچے، محل کے دروازے پر نواب صاحب منتظر ملے، میں ان سے اور بیگم صاحبہ سے ملا، اور سیدھا اُن کے لڑکے کے کمرے میں پہنچا۔ اُسے اچھی طرح دیکھا واقعی وہ لوگ بہت گھبرائے ہوئے تھے۔ میں نے سب کو دلاسہ دیا اور اُنکے کمروں میں واپس بھیج دیا۔ خود ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔ اُسے اچھی طرح دیکھا، بیس بائیس سال عمر ہوگی تیکھا ناک نقشہ، چہرے پر بھولاپن، نہ خوبصورت اور نہ بدصورت۔ میں نے اتنے

مختصر سے وقفے میں اُس سے دوستی کر لی، صبح تک وہ بالکل نہ سویا۔ میں نے اُسے بولنے کی ممانعت کر رکھی تھی۔ میں اُسے باتیں سناتا رہا، دلچسپ باتیں، لطیفے، چھوٹی موٹی کہانیاں قصے،

صبح کو اُس کی آنکھ لگ گئی، اور گیارہ بجے تک سوتا رہا۔ اس اثنا میں میں نے سارے محل کو اچھی طرح دیکھا، نواب صاحب کے کنبے کے تمام افراد سے ملا، خوب باتیں ہوئیں معلوم ہوا کہ لڑکے کا نام جاوید ہے، بی۔ اے کر چکا ہے، نواب صاحب زیادہ پڑھانا نہیں چاہتے، اکلوتا لڑکا ہے اور سب کا لاڈلا ہے اسے باہر بھیجنا پسند نہیں کرتے۔ سال بھر سے یہیں ہے، اور آج کل اسے ریاست کا کاروبار سکھایا جا رہا ہے۔ بڑا شرمیلا اور خاموش طبیعت ہے اور بیحد حساس ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر نواب صاحب کے کوئی دوست رہتے ہیں۔ جو بہت بڑے رئیس ہیں، ان کا ارادہ ہے کہ اُن کی لڑکی جاوید کے لئے مانگ لیں لیکن جاوید بالکل چپ ہے کچھ بھی نہیں بولتا۔ سارا سارا دن اکیلا بیٹھا کتابیں پڑھتا رہتا ہے۔ نہ اسے شکار کا شوق ہے نہ ریاست کے انتظام کا۔ اتنے آدمی نواب صاحب سے ملنے آتے ہیں۔ یہ سب سے دور دور رہتا ہے۔ اور نواب صاحب نہایت سخت طبیعت کے ہیں، لوگ انہیں سنگدل اور بے رحم کہتے ہیں، انہیں اپنے خاندان کی عزت اور وجاہت کا بہت خیال ہے۔ اور اسی لئے وہ بیحد مغرور ہیں۔ وہ کسی کے ہاں ملنے نہیں جاتے، اُن کے گنے گنائے دوست ہیں اور وہ سب اونچے خاندان کے ہیں۔ اس جنگل میں بھی انہوں نے اپنے رسم و رواج کو نہیں چھوڑا، اور اُس جاہ و جلال کو برقرار رکھا ہے۔ جو بزرگوں نے انہیں ورثے میں دیا تھا۔ وہ اپنے بچوں سے جس قدر محبت کرتے ہیں۔ اُسی قدر

اُن سے سختی برتتے ہیں۔ اپنا پیار کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ سب کام اُن کی مرضی کے مطابق ہوتے ہیں کسی کو اُن کے سامنے چوں چرا کرنے کی بھی ہمت نہیں۔

دوپہر کو میں نے جاوید کا پلنگ باہر دھوپ میں نکلوایا، دوائی دی اور کھانے کو کہا، اُسے بھوک نہیں تھی لیکن اُس نے میرا کہنا نہیں ٹالا اور ہم باتیں کرنے لگے۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ یہ شخص مجھ سے بالکل مختلف ہے، ہماری عادتیں نہیں ملتیں۔ اور پھر وہ گوشہ نشین ہے، میں سیاح۔ ہمارے مذاق بھی مختلف ہیں، یہ اُن لوگوں میں ہرگز نہیں ہے جنہیں میں پسند کرتا ہوں۔ لیکن پھر بھی نہ جانے اس میں وہ کون سی خوبی ہے، وہ کیا جاذبیت ہے، جسے میں بیان نہیں کرسکتا۔ جو مجھے اچھی معلوم ہوئی۔ شاید اُس کی غیر مطمئن اور حساس نگاہیں، یا کمزور سا دبلا پتلا جسم۔ کیونکہ مجھے ہٹے کٹے اور مضبوط انسانوں کے بعد ایسے لوگ پسند ہیں جو بالکل ہی کمزور ہوں۔ اُنہیں دیکھ کر میرا جی یہی جی چاہتا ہے کہ کسی طرح ان کی حفاظت کروں۔ ان کے لئے کسی سے لڑ پڑوں، حالانکہ یہ ایک عجیب سا خیال ہے، کسی سے خواہ مخواہ لڑ پڑنا — نہایت احمقانہ خیال ہے — لیکن جھوٹ کیوں بولوں بعض اوقات یہ خیال میرے دل میں آتا ضرور ہے۔

دوپہر کو ڈاکٹر صاحب آئے، اور دیکھ کر چلے گئے، جاوید کی حالت اب پہلے سے بہت بہتر تھی اور اب اُسے بولنے میں ذرا تکلیف نہ ہوتی تھی۔

وہاں میں نے ایک بڑی سیدھی سادھی سی لڑکی بھی دیکھی، ایک نازک سی لڑکی جس کی آنکھوں میں ایسا خمار تھا جیسے خواب دیکھ رہی ہو۔ کچھ ایسی حسین بھی نہ تھی لیکن

ایسا معصوم چہرہ میں نے مدتوں سے نہیں دیکھا تھا۔ نیچی نگاہیں سمٹی سمٹائی، میلے کپڑوں میں لپٹی ہوئی، بات بات پر "جی ہاں" ذرا ذرا دیر کے بعد وہ جاوید کے کمرے میں آجاتی تھی۔ رات کو جب جاوید سو گیا تو چپکے سے وہ آئی اور سرہانے بیٹھ کر جاوید کا سر ہولے ہولے دبانے لگی، مجھ پر نیند کی غنودگی طاری ہو چکی تھی میں جب چونکا تو چار بجے تھے اور وہ لڑکی چپ چاپ بیٹھی جاوید کا سر دبا رہی تھی، اُس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ ٹکٹکی باندھے جاوید کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے بمشکل اُسے وہاں سے اٹھایا۔ صبح کو میں نے جاوید سے ذکر کیا، اُس نے بتایا کہ یہ اُن کی خادمہ ہے، زاہدہ نام ہے، اس کی والدہ بیگم صاحبہ کی باندی تھی۔ یہ چھوٹی سی تھی کہ اس کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور بیچاری کی پرورش اچھی طرح نہ ہو سکی نوکروں اور خادماؤں کی جھڑکیاں، چاروں طرف سے لاپرواہی، سخت سست الفاظ کسی نے کھانے پر ساتھ بٹھالیا تو بیٹھ گئی ورنہ کئی دنوں تک بھوکی رہتی، مدتوں پیار بھرا بول نصیب نہ ہوتا۔ ذرا سے قصور پر سب کے سب ڈانٹتے۔ جب دیکھو کسی تنہا گوشے میں چپ چاپ بیٹھی ہے آنکھیں نمناک ہیں اور کچھ سوچ رہی ہے۔ اب بھی اکثر غمگین ہی رہتی ہے، بیچاری کو اپنی والدہ کے انتقال کا بڑا افسوس ہے۔ بیگم کبھی کبھار اچھی طرح بول لیتی ہیں، ورنہ سب جھڑک کر بولتے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت بے انصافی برتی جاتی ہے جاوید کی ہم عمر ہے۔ بچپن میں اکٹھے کھیلے ہیں، اسی لئے جاوید کا سب سے زیادہ خیال رکھتی ہے، جاوید کو بھی اس پر بہت ترس آتا ہے۔ لیکن کچھ کر نہیں سکتا کیونکہ نواب صاحب نوکروں کو بالکل حقیر سمجھتے ہیں اور اگر جاوید یا کوئی اور اُن کی حمایت میں ایک لفظ بھی منہ سے نکال دے تو قیامت بپا ہو جائے۔ شاید زاہدہ نے اپنی زندگی میں

ایک خوشی بھی نہیں دیکھی، ایک چھوٹی سی خوشی بھی تو نہیں دیکھی۔ شاید یہ نہیں جانتی کہ خوش کس طرح ہوتے ہیں، مسرور ہونا کسے کہتے ہیں۔

اتنے میں وہ پھولوں کے گلدستے لائی اور گلدانوں میں سجانے لگی، اُس کا غمگین اور مظلوم چہرہ بے حد پُرشفقت اور مہربان چہرہ — اُس پر ایسی مردنی جیسے کسی بُت کا چہرہ ہو، الجھی ہوئی لٹیں جن میں عرصے سے کنگھی نہیں کی گئی تھی۔ میلا سا دوپٹہ، اور ننھے منّے گورے گورے ہاتھ جو پھولوں کو ترتیب دے رہے تھے۔ مجھے اُس پر بڑا ترس آیا، کیا واقعی اس غریب لڑکی نے آج تک ایک خوشی بھی نہیں دیکھی۔ اس مسکراتی ہوئی دنیا میں، اس روشن اور پُرکیف دنیا میں جہاں ہر روز طلوعِ آفتاب کے ساتھ مسکراہٹیں اور مسرتیں تقسیم ہوتی ہیں۔ وہاں اس لڑکی کا کوئی بھی حصہ نہیں؟ کیا اسے ایک ننھی سی امید یا ذرا سی مسرت بھی نہیں مل سکتی۔

سارے محل میں صرف یہی چہرہ ہے جو مرجھایا ہوا ہے، ورنہ نواب صاحب کی لڑکیاں بھی تو ہیں، جن کے چہرے زندگی کی حرارت سے یوں تپ رہے ہیں کہ پاس کھڑے ہونے سے آنچ آتی ہے۔ بیگم کی عمر کا اب عہدِ خزاں ہے۔ لیکن اب بھی اُن کے چہرے پر گذشتہ بہار کے آثار ہیں، جسے بھی دیکھو کچھ امیدیں دل میں لئے ہوئے ہے لیکن یہ لڑکی سب سے مختلف ہے۔

جب وہ جا چکی تو ہم نے پھر باتیں شروع کر دیں، شکار کا ذکر چھڑ گیا۔

جاوید بولا۔ "جو سچ پوچھو تو مجھے شکار سے نفرت ہے۔"

میں نے وجہ دریافت کی تو وہ بولا "اس لئے کہ مجھے جانور اچھے لگتے ہیں، مجھے حیوانوں سے پیار ہے اور سب سے زیادہ عزیز مجھے پرندے ہیں، جو ہر صبح ہمیں طرح

طرح کے نغمے سناتے ہیں، جن کا مقصد ہمیں مسرور کرنا ہے، بغیر کسی معاوضے کے وہ ہمارے سامنے بیٹھ کر چہکتے ہیں۔ قسم قسم کے رنگین پروں سے سج کر، سنگار کرکے ہمارے سامنے آتے ہیں محض ہمارا دل لبھانے کے لیے۔ اور یہ کس قدر ظلم ہے کہ ہم ایک ننھے سے پرندے کو محض اس لیے کچل رہے ہیں کہ اُس کے ننھے سے جسم سے ہماری غذا کا سامان ہوگا، یا اس لیے کہ اس سے ہماری تفریح ہوگی، ہمیں ایک عجیب طرح کی شیطانی خوشی ہوگی، کیونکہ ہمیں شکار کر چکنے کے بعد اپنے شکار سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی۔ میری نگاہوں میں تو یہ گناہ ہے۔ ہم پرندوں کے جانی دشمن ہیں اور ہم انہیں مار ڈالیں گے یہ جانتے ہوئے بھی وہ ہمارے پاس آجاتے ہیں، پھر سے اڑ کر سامنے آبیٹھتے ہیں اور سیٹیاں بجانے لگتے ہیں۔ پرندے واقعی انسان کے دوست ہیں + کتے کو چاہو جتنا مارو، جتنی بے رحمی سے چاہو پیٹو۔ جب تھک کر بیٹھ جاؤ گے تو وہ چپ چاپ آکر تمہارے قدموں میں سر رکھ دے گا۔ میں نے ایک کتے کو دیکھا جسے اس لیے گولی سے مارا جا رہا تھا کہ وہ بوڑھا ہو گیا تھا اور اب خدمت کے قابل نہ رہا تھا، اُس کی ٹانگ زخمی ہو چکی تھی۔ لیکن ابھی تک جان نہ نکلی تھی۔ تین دفعہ وار خالی گیا، اتنے میں اتفاق سے کتے کی زنجیر ٹوٹ گئی اور وہ اپنے آقا کی طرف بھاگا۔ جس کے ہاتھ میں بندوق تھی۔ سب نے یہی سمجھا کہ اب کاٹ کھائے گا، لیکن نزدیک پہنچ کر کتا زمین پر لیٹ گیا اور اپنے آقا کے قدم سونگھنے لگا۔ تم نے غالباً کسی زخمی ہرن کی آنکھوں کو غور سے نہیں دیکھا، جب وہ مرنے لگتا ہے۔ تو انسان کو کیسی نگاہوں سے دیکھتا ہے، جیسے کہہ رہا ہو کہ مجھے تم سے ہرگز یہ اُمید نہ تھی ......"

میں نے جلدی سے موضوع بدل دیا، اور ہم سیاحت کی باتیں کرنے لگے۔
اور جب میں نے کہا کہ مجھے سیاحت جان سے زیادہ عزیز ہے تو اُس نے اختلاف کیا۔ وہ بولا "تم بہت سی چیزوں کو ذرا ذرا سی دیر کے لیئے دیکھتے ہو، اور دیکھتے ہوئے تیزی سے گذر جاتے ہو۔ اس خیال سے کہ شاید یہاں پھر کبھی واپسی نہ ہو گی لیکن میں جس چیز کو بھی دیکھتا ہوں بہت دیر تک دیکھتا رہتا ہوں۔ حتےٰ کہ اُسے اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں، اُس کے قریب پہنچ جاتا ہوں، تم محض دیکھتے ہو اور میں سوچتا ہوں۔ مجھے قدرت کا سب سے قیمتی عطیہ فرصت میسّر ہے میرے پاس کافی وقت ہے اور میں اسے بخوبی ضائع کر سکتا ہوں۔ سیّاح ہمیشہ بےچین رہتے ہیں مصروف رہتے ہیں اُن کے پاس بالکل وقت نہیں ہوتا، اور میں مطمئن ہوں، میں خوب مطالعہ کرتا ہوں کتابوں کا، انسان کا، زندگی کا، قدرت کا اور قدرت کو میں نے بے شمار زاویوں سے دیکھا ہے اور بے چینی سے مجھے نفرت ہے، اِس مختصر سی زندگی میں ہم نہ تو سب کچھ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سب کچھ سمجھ سکتے ہیں، تو پھر اس بے چینی کا مطلب؟"
اُس شرمیلے، حساس اور خاموش طبیعت نوجوان کی یہ گفتگو میں بڑے غور سے سن رہا تھا۔

"واقعی دنیا میں طرح طرح کی دلچسپیاں ہیں، رنگینیاں ہیں۔ نظّارے ہمیں تلاش نہیں کرتے، ہمیں اُن کی تلاش کرنی پڑتی ہے۔ پھر بھی مجھے سیاحت پسند نہیں لیکن میں ناشکرا نہیں ہوں۔ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جب میرا سر اپنے معبود کے سامنے نہیں جھک جاتا۔ اُس کے احسانوں کے بوجھ سے ہر صبح اُٹھ کر میں اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ اُس نے مجھے بینائی جیسی نعمت بخشی، جس نے میری آنکھوں میں

نور عطا کیا ورنہ یہی دنیا کتنی تاریک معلوم ہوتی ہے؟"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے۔" میں نے کہا "تم ایک ذہین اور قابل نوجوان ہو، تمہارے پاس سب کچھ ہے، تم ایک نہایت اچھے خاوند بن سکتے ہو، تمہارے دل میں جو اعلیٰ خیالات آتے ہیں وہ تنہائی میں ضائع ہو جاتے ہیں، تم اگر کسی کو اپنی تنہائی کا شریک بنا لو تو تمہاری خوبیاں دُگنی ہو جائیں گی، اور پھر تمہیں کوئی نگران بھی تو چاہیئے۔"

"اور تم اب تک کیوں تنہا ہو؟ تم بھی تو ــــ"

"میرا کیا ہے، آج یہاں کل وہاں، آج کچھ سوچ رہا ہوں کل کچھ، میرے خیالات نظریے، یہاں تک کہ اصول تک بدلتے رہتے ہیں بعض اوقات میں اپنے آپ پر تعجب کرتا ہوں کہ اتنی فوری تبدیلیاں مجھ میں کیونکر آ جاتی ہیں، میں کچھ خبطی سا ہوں، آج تک میں نے کچھ بھی کہیں حاصل نہیں کیا، ہر جگہ اور ہر موقع پر کچھ نہ کچھ کھو دیتا ہوں، جس کام میں ہاتھ ڈالتا ہوں اسے بگاڑ کر رکھ دیتا ہوں جب مشکلیں درپیش ہوں تب بھی پریشان رہتا ہوں اور جب کوئی مشکل نہ ہو سکون ہی سکون ہو تب بھی پریشان رہتا ہوں اور پھر مجھ جیسے آوارہ گرد کا کیا اعتبار لیکن تمہاری اور بات ہے وہ تمام خوبیاں تم میں موجود ہیں۔ جن کی تلاش لڑکیوں کو رہتی ہے۔"

"لیکن مجھے اب تک وہ لڑکی نہیں ملی جس کی مجھے تلاش ہے، میں خوبصورت نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے کسی حسین لڑکی کی تلاش ہے۔ میں اکثر بیمار رہتا ہوں ویسے بھی میں کمزور ہوں۔ تنہائی پسند ہوں، میں اپنی کمزوریوں کو کسی کی محبت میں چھپا لینا چاہتا ہوں۔ میں کہیں پناہ لینا چاہتا ہوں۔ میں شاید کسی کو ذرا سی محبت بھی نہ دے سکوں، لیکن مجھے بہت زیادہ محبت چاہیئے، ایسی محبت جو سدا سر سبز رہے جو ہمیشہ بڑھتی جائے جو کبھی ختم نہ ہو، ہمیشہ بڑھنے والی محبت اتنی کہ چاروں طرف سے محبت

کی بارش ہونے لگے، میں محبت میں دب کر رہ جاؤں، پس کر رہ جاؤں۔ اور ابّا نے میرے لئے اپنے ایک دوست کی لڑکی چُنی ہے جو حسین ہے، مغرور ہے، جسے اپنے سوا اور کسی کا خیال نہیں، جو شاید محبّت کے مفہوم سے ناواقف ہے۔ لیکن میرے خوابوں کی لڑکی اس سے مختلف ہے، آج تک وہ مجھے نہیں ملی، مجھے مدت سے اُس کی تلاش ہے، لیکن مجھے امید ہے، پُختہ امید ہے کہ وہ ضرور مل جائے گی، اور جب وہ مل گئی تو میری نئی زندگی شروع ہوگی"۔

دیر تک ہم باتیں کرتے رہے، اس نحیف جسم کے اندر ایسا دل تڑپ رہا ہے یہ مجھے معلوم نہ تھا، اُس کے خیالات کے سامنے میرے سب نظریے ہیچ معلوم ہونے لگے، اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے کچھ احساس کمتری ہونے لگا۔

میں چند روز اور وہاں رہا، جاوید کی باتوں کے بعد اگر مجھے کسی نے متأثر کیا تو وہ زاہدہ تھی، غمگین اور اداس زاہدہ، غم شاید اُس کے رونئیں رونئیں میں رچا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ غم اس کی روح میں حلول کر گیا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ بھی اُس کی نگاہیں اونچی نہ دیکھیں، کبھی اُس کے معصوم چہرے پر مسرت کی ننھی سی کرن تک نہ دیکھی، میں سوچنے لگتا، کہ یہ کب تک غمگین رہے گی؟ اس لڑکی کا مستقبل کیا ہے؟ کیا کبھی اس کے صبح شام بھی بدلیں گے؟ یا یہ تنہائی اور غم کی اس دھند میں اپنے دن گذار کر جھکی سی نظریں جھکائے اِس دنیا سے رخصت ہو جائے گی۔

نواب صاحب کی لڑکیاں بیحد حسین اور جاذب نگاہ تھیں، مجھے ان کا قرب بھی حاصل تھا، لیکن اُن کا تمتمایا ہؤا حسن اور مسکراہٹیں مجھے متوجہ نہ کر سکیں جتنی دیر میں وہاں رہا زاہدہ کے متعلق سوچتا رہا۔ مجھے اُس غریب لڑکی پہ بڑا ترس آیا،

میرا جی چاہا کہ میں اس لڑکی کے لئے کچھ کر سکوں، جب میں وہاں سے لوٹا تو سب بڑے تپاک سے ملے، جب میں ایک دروازے سے گذر رہا تھا تو کواڑ کی اوٹ میں کھڑی ہوئی زاہدہ ملی، اُس نے ہاتھ ماتھے تک لیجا کر مجھے سلام کیا، جیسے میری بیحد شکر گذار ہو۔ جیسے میں نے اُس پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔

جاوید جواب بالکل تندرست تھا تھوڑی دور تک مجھے چھوڑنے آیا۔ کچھ دیر کے بعد میں منہ میں سگریٹ دبائے لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا جنگل سے گذر رہا تھا۔

چند روز ڈاکٹر صاحب کے ساتھ گذار کر میں واپس چلا آیا۔

کچھ عرصے کے بعد میں سب کچھ بھول گیا، خط و کتابت میں تو میں پہلے سے ہی سُست ہوں، اور پھر چوبیس گھنٹے کی مصروفیت۔ ذراسی چھٹی ملی تو جدھر کی دھن سوار ہوئی نکل گیا۔

اسی طرح دن گذرتے گئے۔ اور ایک روز یکایک مجھے محسوس ہوا کہ میں تھک گیا ہوں۔ اور اب مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ ایک لمبی سی چھٹی لیکر میں سیاحت کے لئے تیار ہو گیا۔ اور نہ جانے مجھے ڈاکٹر صاحب، جاوید اور زاہدہ سب کیونکر یاد آ گئے، میں انہیں بالکل بھول چکا تھا۔ اور اس یاد نے میرا سارا پروگرام بدل دیا۔ میں سیدھا ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا۔ ملتے ہی پہلا سوال میں نے نواب صاحب کے متعلق پوچھا، ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ آج کل اُن کے محل میں ایک قیامت بپا ہے، زاہدہ اور جاوید کی محبت کا چرچا سب کی زبان پر ہے، پہلے یہ ایک چنگاری تھی اور اب کچھ اس طرح بھڑکی ہے کہ اس کے شعلے دُور دُور تک

پہنچ گئے ہیں۔ زاہدہ پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے ہیں، اُس کی زندگی تلخ ہو گئی ہے، نواب صاحب کے غم و غصہ کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے، وہ اس بے عزتی کو ہرگز برداشت نہیں کر سکتے، اس سے خاندان کی عزت خاک میں مل جاتی ہے، اس سے خاندان کی توہین ہوتی ہے۔ خاندان کے جاہ و جلال میں فرق آتا ہے، بھلا وہ کس طرح برداشت کر سکتے ہیں کہ اُن کا اکلوتا بیٹا ایک ادنیٰ سی خادمہ سے شادی کرلے، ایک حقیر باندی کی بیٹی کو وہ کیونکر اپنی بہو بنا سکتے ہیں؟ جاوید پر اُن کا عتاب نازل ہے، وہ اس سے بے حد خفا ہیں، اور انہوں نے کسی اور کی زبانی صاف کہلوا دیا ہے کہ اگر جاوید نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا تو نواب صاحب تمام عمر اُس کی شکل نہ دیکھیں گے اور اُسے ریاست سے اور ساری جائداد سے عاق کر دیں گے۔ غرضیکہ وہاں ایک عجیب پریشانی پھیلی ہوئی تھی، لیکن نہ جانے یہ بات مشہور کیونکر ہو گئی، اُن دونوں کی محبت اب تک بالکل خاموش رہی تھی، آج تک ایک لفظ بھی اُن کے منہ سے نہیں نکلا، نہ اُنہوں نے اس راز میں کسی کو شریک کیا تھا، بس ویسے ہی یہ بات مشہور ہو گئی۔ لیکن محبت کے افشا ہونے کے لئے تقریر ضروری نہیں، یہ تو آنکھوں سے ہی جھلکنے لگتی ہے۔

یہ سن کر میں بے چین ہو گیا، زاہدہ اور جاوید کی محبت، کیا سچ مچ جاوید اس غمزدہ اور معصوم سی روح سے محبت کرتا ہے، کیا واقعی زاہدہ کی تاریک دنیا میں اجالا ہوتا جا رہا ہے، کیا واقعی اُس کے صبح و شام بدلتے جا رہے ہیں، اور کیا جاوید کو اپنے خوابوں کی ملکہ مل گئی؟ جس کی اُسے تلاش تھی،

میرا جی چاہتا تھا کہ اُن دونوں سے ملوں، لیکن ان حالات میں میں نے جانا

مناسب نہ سمجھا، ویسے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ زاہدہ کی زندگی میں محبت طلوع ہوئی ہے، ایک لڑکی کی زندگی کا سب سے اہم واقعہ، ایک لڑکی کی سب سے بڑی دولت، اُس کا عزیز ترین سرمایہ۔ ایسا بیش قیمت لمحہ جو فقط ایک بار ہی آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے بعد میں اور باتیں بھی بتائیں، کہ زاہدہ کی صحت گرتی جا رہی ہے، کوئی ہفتہ ایسا نہیں گذرتا جب وہ بیمار نہ ہوتی ہو، اور جاوید کی پریشانی کی کوئی انتہا نہیں، اُسے زاہدہ سے دیوانہ وار محبت بھی ہے اور وہ ایک فرمانبردار اور نیک لڑکا بھی ہے۔ وہ نواب صاحب کے سامنے ایک لفظ نہیں بول سکتا۔ اِس معمے کا حل کیا ہوگا؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔ اُسی شام کو اطلاع ملی کہ زاہدہ سخت بیمار ہے، ڈاکٹر صاحب کو بلایا تھا، میں بھی ساتھ گیا، اِس مرتبہ مریض محل میں نہیں تھا بلکہ محل کے پچھواڑے ایک ٹوٹی پھوٹی کوٹھڑی میں، جس میں ایک دُھندلی سی لالٹین جل رہی تھی، نہ کوئی ہمارا انتظار کر رہا تھا، نہ کسی نے ہمارا استقبال کیا، کوٹھڑی میں ہمیں ایک بوڑھی ماما ملی جو ہمیں دیکھ کر باہر چلی گئی۔ زاہدہ اندر بیہوش پڑی تھی، ایک میلے کچیلے بستر میں لپٹی ہوئی تھی، کوٹھڑی میں مٹی کے تیل کی بُو آ رہی تھی اور چاروں طرف عجیب سی بے سروسامانی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے بغور معائنہ کیا، کچھ دیر سوچتے رہے اور پھر مایوس ہو کر واپس جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ زاہدہ کو ڈبل نمونیہ ہو گیا تھا، اُس کے پھیپھڑے پہلے ہی کمزور تھے۔ اور اب وہ سیّال مواد میں ڈوبے ہوئے تھے، جس سے اُسے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو بہت دیر میں اطلاع بھیجی گئی تھی، اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہم پچکاری سے وہ مواد کھینچ لیں، لیکن ڈاکٹر صاحب کے خیال

ہیں اب سب کچھ فضول تھا کیونکہ اب زاہدہ کا چہرہ نیلا ہوتا جارہا تھا۔ مریضہ کی زندگی فقط چند گھنٹے اور تھی، اُس کے پھیپھڑے اس درجے تک ناکارہ ہو چکے تھے۔ کہ اب کوئی دوائی انہیں اصلی حالت پر نہیں لاسکتی تھی۔

لیکن مَیں نہ مانا، شاید اس لئے کہ میں ابھی نو عمر ہوں اور مجھے ان ہونی باتوں پر یقین ہے، پل بھر میں مَیں ہوائی قلعے بنا لیتا ہوں، ناممکن سے ناممکن امیدیں میرے دل میں مچلنے لگتی ہیں، میں نہ مانا۔ میں نے اصرار کیا کہ میں یہیں ٹھہرونگا، سارے جتن کرونگا، اور اگر کچھ نہ ہوسکا تو اُس وقت یہاں سے جاؤں گا۔ جب مریضہ کے سانس ختم ہو چکیں گے۔

آخر ڈاکٹر صاحب مجھے اپنا بیگ دیکر واپس چلے گئے، اور میں زاہدہ کے پاس بیٹھ گیا، وہ بدستور آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی۔ دُبلی پتلی کمزور زاہدہ جس کی زندگی کا سورج غروب ہو رہا تھا، اُس کے چہرے پر نہ سرخی تھی نہ زردی، بلکہ ہلکی ہلکی نیلی جھلک آتی جارہی تھی جو موت کی نقیب ہوتی ہے۔

دفعتاً زاہدہ کے ہونٹ ہلے، اور آہستہ سے اُس نے کہا۔ "جاوید"۔

اور جاوید وہاں نہیں تھا، شاید اُسے وہاں آنے کی ممانعت تھی۔

وہ بے ہوشی کے عالم میں بول رہی تھی —— "جاوید —— جاوید"۔ وہ مرنے سے پہلے اپنے محبوب کو ایک بار دیکھنا چاہتی تھی، یا اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی جو اب تک نہ کہہ سکی، اُسے کوئی ایسی امانت سپرد کرنا چاہتی تھی جو اس نے اب تک سنبھال کر رکھی۔

میں نے اُس کا سرد ہاتھ اپنی انگلیوں سے چھُوا، نبض گننے کے لئے۔ میں کچھ

محسوس نہ کر سکا، اُس کا دل تھک کر خاموش ہونے والا تھا۔

"زاہدہ!" میں نے اُس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "زاہدہ! — بولو"

اُس نے آنکھیں کھول دیں، اور مجھے دیکھنے لگی۔

"زاہدہ!"

"جی!" اُس نے بڑی مشکل سے کہا۔

"کیا بہت زیادہ درد ہے؟"

"جی!" آپ کب آئے؟ — اچھے تو ہیں؟"

"میں ابھی آیا ہوں، تم بالکل مت گھبراؤ — میں تمہیں تندرست کرنے آیا ہوں"

"لیکن مجھے تو جینے کی کوئی خواہش نہیں رہی۔ آج ہی رات میرے سانس تمام ہو جائیں گے، اس دن کا مجھے بڑا انتظار تھا۔ اس دن کی مجھے بڑی آرزو تھی۔ اور آج جب میں مر جاؤنگی تو نہ یہ مصیبتیں باقی رہیں گی اور نہ یہ ہمیشہ رہنے والا عذاب"

"میں تمہیں مرنے نہیں دونگا۔ زندگی موت سے کہیں طاقتور ہے، پہلی مرتبہ جب میں یہاں آیا تھا تو جاوید کو تندرست کر کے گیا تھا اور اب میں تمہیں سنبھال لونگا تم اچھی ہو جاؤ گی"

اُس نے ایک بار میری جانب پھر دیکھا، اُس کی غمزدہ آنکھوں میں آنسو تھے اُس پر غنودگی طاری ہو گئی اُس کی آنکھیں بند ہو گئیں، بے ہوشی کے عالم میں اُس نے پھر کہا — "جاوید" — جاوید"

اور میرا جی چاہا کہ کہیں سے جاوید کو بلا لاؤں، دنیا کے اُس سرے سے اُسے اٹھا لاؤں اور اس کے سامنے لا کھڑا کروں۔

اتنے میں کوئی آیا، میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، یہ نواب صاحب تھے۔ انہوں نے اشارے سے مجھے بلایا، دروازے میں کھڑے ہو کر مجھ سے ملے مختصر الفاظ میں میرا مزاج پوچھا، آنے کا شکریہ ادا کیا اور پھر بولے — "کیا اسے اسی وقت قصبے کے ہسپتال میں بھیجا جا سکتا ہے؟"

"ہاں! اگر یہ صبح تک زندہ رہی تب امکان ہو سکتا ہے لیکن آپ اسے پہنچائیں گے کس طرح؟"

"ڈولی میں بھیجدینگے۔"

"ڈولی میں؟ اس کی حالت بالکل نازک ہے، اتنے جھٹکے یہ برداشت نہ کر سکیگی۔"

"لیکن میں اسے اسی وقت بھیجنا چاہتا ہوں، مجھے اسکی بیماری کی ذرا پروا نہیں نہ مجھے اس کی موت کی پروا ہے، آپ نے شاید سب کچھ سن لیا ہوگا، اس حقیر لڑکی نے ہمارے ہاں آگ لگادی ہے، ایک ادنیٰ باندی کی بیٹی نے ہمیں پریشان کر دیا ہے، اور بدقسمتی سے آج میرے عزیز دوست اور جاوید کے ہونے والے خسر یہاں آئے ہوئے ہیں، یہ بات اُن کے کانوں تک پہنچ چکی ہے، اُدھر وہ نامعقول لڑکا اس سے ملنے کے لئے تڑپ رہا ہے، اُدھر یہ سارا دن اُسے پکارتی رہی ہے، میں اپنے لڑکے کو جان سے ماردونگا۔ لیکن اب اس سے باتیں نہ کرنے دوں گا، اور پھر اُس کمبخت کے ہونے والے خسر یہیں ہیں، کیا میں یہ تماشا اُنہیں دکھا دوں؟"

میں چپ کھڑا تھا۔

"آپ اس وقت مجھے ظالم اور سنگدل سمجھ رہے ہونگے، لیکن میں یہ کیونکر برداشت کر سکتا ہوں، اس حقیر لڑکی کی یہ جرأت، آخر کیا سمجھ کر اس نے یہ گستاخی کی؟ اور اگر وہ لڑکا ——"

اُن کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا اور وہ چلّا کر بولے — "یہاں بلاؤ اُس کمبخت کو، ابھی سب کچھ طے ہو جائے گا، یہ لڑکی خواہ مرے یا جیئے ابھی یہاں سے نکال دی جائے گی، اور جاوید کی زبان سے اسے یہ بھی سنوا دونگا کہ وہ اس سے نفرت کرتا ہے۔ وہ اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔"

جاوید کمرے میں آیا، اُس کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کا سارا کنبہ، بیگم لڑکیاں، بچے، اور ایک سرخ و سفید چہرے کے عمر رسیدہ شخص، جو غالباً نواب صاحب کے دوست اور جاوید کے ہونے والے خسر تھے۔

نواب صاحب نے اپنے نوکروں کو حکم دیا کہ ایک ڈولی کا انتظام کیا جائے جاوید بُت بنا کھڑا تھا، سہما ہوا، گھبرایا ہوا، جیسے وہ نواب صاحب کی ساری شرطیں قبول کرلے گا، جیسے وہ فوراً ہتھیار ڈال دے گا، فوراً ہار جائے گا۔

نواب صاحب بولے — "میں اس لڑکی کو قصبے کے ہسپتال میں بھیج رہا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس سے صاف صاف کہدو کہ تم اسے نہیں پہچانتے، یہ تمہارے لئے اجنبی ہے، تمہیں اس کی پروا نہیں، تم اس سے نفرت کرتے ہو تاکہ اس کی رہی سہی غلط فہمی بھی دور ہو جائے۔ غضب خدا کا، ایسے خاندان کا ایک فرد ایک خادمہ کو پسند کرے، خدا جانے کس نے یہ افواہ پھیلا دی، بھلا یہ کہیں ممکن بھی ہو سکتا ہے، خیر! اب بھی اس غلط فہمی کا ازالہ ہو سکتا ہے، جاوید بیٹے تم اس کے پاس جا کر صاف صاف کہدو۔"

اور جاوید مٹی کی مورت بنا ہوا چپ چاپ کھڑا تھا، اُس کی نگاہیں فرش پر گڑی ہوئی تھیں۔ نواب صاحب کے سامنے آج تک اُس نے ایک لفظ تک نہیں بولا،

تھا، "جاوید!" نواب صاحب چلا کر بولے "سنتا نہیں، میں کیا کہہ رہا ہوں۔ چل آگے بڑھ اور اس سے کہہ دے کہ تو اس سے نفرت کرتا ہے"۔ اور جاوید کے قدم جیسے زمین سے سل گئے تھے، وہ وہیں کھڑا تھا۔

"جاوید! کمبخت ناہنجار لڑکے! تو میری توہین کرتا ہے، تو میرا حکم رد کرتا ہے، ان سب کے سامنے تو میرا حکم رد کرتا ہے"۔ نواب صاحب غصّے سے کانپنے لگے۔ "بچّوں کے سامنے تو میری توہین کر رہا ہے، یہ آخری بار کہہ رہا ہوں، یہ آخری بار میں حکم دے رہا ہوں اور اگر تو نے تعمیل نہ کی تو میں تجھے کبھی معاف نہ کروں گا، تجھے گھر سے نکال دوں گا، تجھے عاق کر دوں گا، عمر بھر تیری شکل نہ دیکھوں گا، چل آگے بڑھ اور اس لڑکی سے کہہ دے کہ تو اسے نہیں پہچانتا، تو اس کی ذرا پروا نہیں کرتا، تجھے اس سے نفرت ہے۔ تو اس سے نفرت کرتا ہے"۔

جاوید بدستور گم سم کھڑا تھا، دفعتاً اُس نے زاہدہ کو دیکھا۔ زاہدہ اب ہوش میں آ چکی تھی اور سب کچھ سن چکی تھی۔ اُس کی نگاہیں جاوید کی نگاہوں سے ملیں، اور جیسے جاوید پر بجلی کا لپکا آن گرا، جیسے کسی نے اُسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، جیسے وہ سوتے سوتے جاگ اُٹھا، جیسے کسی نے اُس شرمیلے اور کمزور جاوید کی جگہ ایک نیا دلیر اور بہادر جاوید لا کھڑا کیا جس کی نگاہیں زاہدہ پر جم گئیں۔ وہ کچھ اس طرح آگے بڑھا جیسے اب اُسے کسی کی پروا نہیں رہی جیسے وہ مقابلے کے لئے تیار ہے۔ پھر اس نے اپنی نگاہیں اُوپر اٹھائیں اور بولا "کیا میں اسے نہیں پہچانتا؟ — کیا میں اس سے محبت نہیں کرتا؟ — کون کہتا ہے؟ — مجھے اس سے محبت ہے، میرا رُواں

رُداں اسے چاہتا ہے۔ آج سے نہیں، برسوں سے میں اس سے محبت کرتا ہوں اب میرے دل و دماغ میں صرف زاہدہ ہی زاہدہ ہے۔ اگرچہ اب یہ سب کچھ بیکار ہے، بہت دیر ہو چکی ہے، مجھے یہ سب کچھ پہلے کہنا چاہیئے تھا، لیکن میں بزدل بنا رہا اب دیر ہو گئی ہے، لیکن کچھ اتنی دیر بھی نہیں ہوئی۔ اگر یہ مر گئی تو آج میری تمنائیں اور آرزوئیں سب مر جائیں گی، میری روح مر جائے گی، اور میں آپکے اس محل میں قدم بھی نہ رکھوں گا، میں سب کے سامنے کہہ رہا ہوں کہ مجھے آپ کے محل کی ان سخت اور اونچی دیواروں سے نفرت ہے، مجھے آپ کی بناوٹی شان و شوکت سے نفرت ہے، مجھے آپ کی مصنوعی باتوں سے نفرت ہے، مجھے یہ محل بھیانک اور تاریک دکھائی دیتا ہے، اِس میں انسان نہیں بستے، میں یہاں رہنا نہیں چاہتا۔ مجھے وہ جنّت نہیں چاہیئے جو آپنے میرے لئے تخلیق کی ہے۔ مجھے آزاد کر دیجئے۔ مجھے تنہا چھوڑ دیجئے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجئے۔"

اور نواب صاحب دم بخود رہ گئے، جیسے انہیں یقین نہ آیا ہو، جیسے اُن کے کانوں نے انہیں دھوکہ دیا ہو۔ وہ بدستور کانپ رہے تھے۔ لیکن اُن کے دست نے آگے بڑھ کر انہیں سنبھال لیا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر باہر لے گئے۔ آہستہ آہستہ مجمع کم ہونے لگا۔ ایک ایک کر کے سب باہر چلے گئے۔ اور میں نے زاہدہ کو دیکھا غرور سے اُس کا سر تن گیا۔ اُس کے نیلے ہونٹ یاقوت کی طرح سُرخ ہو گئے۔ اُس کے گالوں پر سرخی دَوڑ گئی، اُس کی آنکھوں میں مسرتیں ناچنے لگیں، وہ مسکرائی ایک غمزدہ اور بے کس لڑکی کی طرح نہیں، بلکہ ایک مغرور اور فاتح عورت کی طرح۔ اُس نے محبت جیتی تھی، عورت کی سب سے بڑی فتح۔ عورت کی سب سے بڑی مسرت۔

وفورِ محبت سے اُس کا چہرہ جگمگا اُٹھا۔ اب شاید اُسے کسی کی پروا نہ تھی، اپنے بیتے ہوئے دنوں اپنے غمگین اور اداس لمحوں، اپنی تنہا زندگی ــ کسی کی پروا نہ تھی۔ اب اُسے کسی کا ڈر نہ رہا تھا اب اُسے موت کا بھی ڈر نہ رہا تھا۔

تب اُس نے جاوید کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اُسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ اپنے خوابوں کے شہزادے کو پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہو۔ تاریکیوں سے ایک دم اُجالے میں آکر اُس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں ہوں، اور اُن نگاہوں میں پیار، اعتماد امید اور شفقت سب کچھ ملے ہوئے تھے۔

اس روپ میں میں نے زاہدہ کو کبھی نہ دیکھا تھا، اور نہ جانے میرے دل میں اتنی ساری امیدیں کہاں سے آگئیں، مجھے کچھ یقین سا ہوگیا کہ میں اسے مرنے نہیں دونگا، میں اب اسے ضرور بچالوں گا۔

میں نے نبض دیکھی، پہلے سے بہتر تھی، ایک آدمی ڈاکٹر کے پاس بھیجدیا۔ کہ اُنہیں فوراً بلا لائے، ایک رقعہ بھی ساتھ دیا جس میں لکھا کہ ہم ضرور وہ مواد پچکاری سے نکالیں گے، اُس کا سامان، اور کئی اور دوائیاں بھی منگائیں جن کی مجھے اب ضرورت تھی۔

جاوید جو اب تک وہیں کھڑا تھا، زاہدہ کے پاس بیٹھ گیا۔

میں باہر نکل آیا، رات کے ایک یا دو کا عمل تھا، آسمان پر سیاہ گھٹا تلی کھڑی تھی، ننھی ننھی بوندیں پڑ رہی تھیں۔

چاروں طرف ایک سنّاٹا تھا، صرف بوندوں کا ہلکا ہلکا شور تھا جو اس خاموشی کو توڑ رہا تھا، درخت، پہاڑیاں، پودے، سب سیاہ لباس پہنے کھڑے تھے۔

چاروں طرف تاریکی تھی، سوائے اُس نامعلوم سی روشنی کے جو اندھیری راتوں میں نہ جانے کہاں سے آجاتی ہے، جب آسمان پہ تارے بھی نہیں ہوتے اور زمین پہ بھی اجالا نہیں ہوتا تب بھی ایک پُراسرار روشنی کہیں سے چھن چھن کر فضا میں سما جاتی ہے، اُس پُراسرار ماحول میں میں نے اپنے آپ کو بیحد لطیف محسوس کیا۔ بالکل ہلکا پھلکا سا جیسے ابھی چاہوں تو اڑتا ہوا فضا کو عبور کرکے کہیں کا کہیں نکل جاؤں۔

میں چلنے لگا، ایک پیچیدہ پگڈنڈی پر چلتا گیا اور ایک اُونچے ٹیلے پہ ٹھہر گیا۔ وہاں سے میں نے محل دیکھا، جس کی اُونچی اُونچی تاریک دیواریں بڑی ہیبتناک معلوم ہو رہی تھیں، جس کے بُرج اور کنگرے دیکھ کر وحشت آتی تھی۔ جو سیاہی میں ملفوف تھا، جو ایک اُجاڑ اور ویران کھنڈر معلوم ہو رہا تھا۔ جہاں کوئی انسان نہ رہتا ہو۔ اور اُس کے پاس ہی ایک چھوٹی سی کوٹھڑی بھی دکھائی دے رہی تھی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا، جس میں مدھم سی روشنی میں دو چہرے نظر آرہے تھے۔۔۔ جو بے چینی سے طلوعِ آفتاب کا انتظار کر رہے تھے۔ آج کی رات اُن کے لئے بڑی ڈراؤنی تھی، ایک ایک لمحہ اُن کے لیئے پہاڑ تھا زندگی اور موت کی کشمکش شروع ہو چکی تھی، کچھ دیر پہلے زندگی ہار چکی تھی۔ لیکن اب دونوں حریف برابر تھے، اور نتیجہ خدا کے ہاتھ میں تھا، سب کچھ میرے سامنے ہو رہا تھا۔ اور زندگی کی جیت پر دونوں کے مستقبل کا دارومدار تھا، اگر صبح زاہدہ نے طلوعِ آفتاب دیکھ لیا تو کل سے دو نئی زندگیاں شروع ہوں گی۔

اور جو سچ مچ زندگی جیت جائے تو۔۔۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا

آسمان بالکل تاریک تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اُس تنہائی اور فضا میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں خدا کے سامنے کھڑا ہوں، جیسے وہ مجھے دیکھ رہا ہو، اور یہ احساس بڑھتا گیا حتیٰ کہ مجھے یقین ہو گیا کہ ان تاریک بادلوں کی اوٹ سے خدا مجھے دیکھ رہا ہے، تب میرا دل دھڑکنے لگا، میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، میرے ماتھے پر پسینہ آ گیا، میرے ہونٹ خشک ہو گئے، اور میں مؤدب کھڑا ہو گیا۔ اور میں نے ایک دعا مانگی، نہ الفاظ میرے لبوں تک آئے، نہ میرے ہونٹ ہلے، بس میں نے دل ہی دل میں دعا مانگی —— کہ اے خدا، جب کبھی میں نے صدق دل سے دعا مانگی تو نے قبول کی۔ آج میں مدت کے بعد دعا مانگ رہا ہوں، زاہدہ کی زندگی واپس بھیج دے۔ اس پر جو موت کا سایہ چھایا جا رہا ہے اُسے ہٹا لے، اب اس لڑکی کو نہیں مرنا چاہیئے۔ اب اس نے دوبارہ جنم لیا ہے۔ میں نے اتنے دنوں تک کچھ نہیں مانگا، انہی دنوں میں تجھ سے کچھ اپنے لئے مانگنے والا تھا، لیکن اب میں کچھ نہ مانگوں گا، مجھے اپنے لئے کچھ نہیں چاہیئے، میں سال بھر اپنے لئے کچھ نہ مانگوں گا۔ صرف زاہدہ کی زندگی دے دے، اگر یہ دعا قبول ہوئی تو مجھے وہاں سے کوئی اشارہ کر دے، آسمان سے کوئی ذرا سا اشارہ کر دے تاکہ میں سمجھ جاؤں —— اسی طرح دیر تک میں کھڑا دعا مانگتا رہا، اتنے میں یکایک ایک تاریک بادل پھٹا، اور ایک جگمگ جگمگ کرتا ہوا تارہ جھانکنے لگا۔ اور پھر جیسے اُس تارے کی چمک بڑھتی گئی حتیٰ کہ میری

آنکھیں چندھیا گئیں۔

چاروں طرف تاریکی تھی، سارے آسمان پر تاریکی تھی، بادلوں نے اُسے اچھی طرح ڈھانپ رکھا تھا، اور ایک ننھّی سی کھڑکی میں سے ایک چمکیلا تارہ رہ رہ کر مجھے اشارے کر رہا تھا کہ تیری دعا قبول ہوئی، تیری دعا قبول ہوئی۔

ایک خط کے جواب میں

آج سہ پہر کو تمہارا خط ملا جب میں نے سات سال کے طویل عرصے کے بعد ایک معطر نیلے لفافے پر تمہارا مخصوص طرزِ تحریر دیکھا تو میں بے چین ہو گیا، آج تک تم نے مجھے کوئی خط نہیں لکھا، کیا ہوا جو چھوٹے موٹے پرزوں پر "ہاں" یا "نہ" لکھدیا ہو یہ تمہارا پہلا خط ہے۔ دیکھتے ہی مجھے یقین سا ہو گیا کہ اسے تم نے ہی لکھا ہے کھولا تو واقعی تمہارا تھا، تم نے لکھا ہے کہ تم اگلے ہفتے یہاں سے گذرو گی اور میں تمہیں اسٹیشن پر ملوں۔ اس خبر نے میری افسردہ روح میں ہلچل پیدا کر دی میرا رُواں رُواں مسرت سے ناچنے لگا۔ میرے پژمردہ لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں تو بالکل ناامید ہو چکا تھا، نہ جانے اتنے دنوں کے بعد تمہیں یکایک میرا خیال کس طرح آگیا؟ یا شاید ان سارے دنوں میں تمہیں یاد رہا ہوں —— اس خیال نے مجھ پر سرور طاری کر دیا، ایک عرصے

کے بعد میں مسرور ہوا ہوں میں تمہارا کس طرح شکریہ ادا کروں، آخر تم نے مجھے یاد کر ہی لیا۔

میں نے سوچا کہ میں ضرور اپنے محبوب کو دیکھوں گا، اُس جگمگاتے ہوئے چہرے کو ایک بار پھر دیکھوں گا، اور اس مرتبہ اپنے دل کے ظلمتکدے کو اُس نور سے بھر لوں گا اور اُن نقوش کو پھر تازہ کر لوں گا جنہیں وقت نے مدھم کر دیا ہے، شاید وہ خود فراموشی وہ دلکش اور پیارے لمحے اور محبت کی وہ سحر کاریاں پھر لوٹ آئیں۔

میں اس طویل عرصے میں تمہارے متعلق سنتا رہا ہوں، سنا ہے کہ تم اب اس قدر حسین معلوم ہوتی ہو کہ تمہارے چہرے پر نظریں نہیں جمتیں، کوئی تمہیں ایک نظر بھر کے نہیں دیکھ سکتا۔ تمہیں دیکھ کر آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ جب میں نے تمہیں آخری مرتبہ دیکھا تھا تو تم ایک محجوب کلی تھیں، شرمیلی اور معصوم سی کلی، سادگی میں لپٹی ہوئی اور اب ایک مہکتا ہوا شگفتہ پھول بن کر جس قدر رعنائیاں اور دلفریبیاں تم پر نچھاور ہوتی ہوں گی اُن کا شاید میں اندازہ نہیں کر سکتا۔

سنا ہے کہ اب تمہاری آنکھوں میں نرالی چمک ہے، نرالا فسوں ہے۔ تمہارے چہرے پر ایک ملکوتی حسن ہے، نئی ملاحت ہے، نئی دلکشی ہے۔ جب تم باتیں کرتی ہو تو سننے والا کھویا سا جاتا ہے! اب بھی تمہاری لٹیں تمہاری چاند سی پیشانی پر پریشان ہو جاتی ہیں، مسکراتے وقت اب بھی تمہارے گالوں میں دو ننھے ننھے گڑھے پڑتے ہیں۔ وہ ننھا منا سا تِل اب بھی تمہاری گردن پر ہے، اور سنا ہے کہ تم بیحد مسرور رہتی ہو، تمہیں زندگی کی سب خوشیاں میسّر ہیں، دنیا کی سب نعمتیں تمہارے قدموں پر قربان ہیں، تمہارے ہونٹوں پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے، تمہارے چہرے سے جیسے کرنیں پھوٹتی ہیں۔

میرا دل مچلنے لگا۔ میں ضرور تمہیں دیکھوں گا، اور ہم پرانی باتیں دہرائیں گے کچھ دیر اکٹھے بیٹھ کر ایک بار پھر ہنسیں گے، میں تو تمہارے چہرے کے نقوش واقعی بھولتا جا رہا ہوں، ویسے وہ نقوش بدل بھی تو گئے ہوں گے، پہلے تم کبھی کبھار غمگین بھی ہو جاتی تھیں اور جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے سنا ہے کہ تم ہر وقت خوشیوں میں گھری رہتی ہو۔ میں تمہیں دیکھ کر کیسا مرعوب ہو کر رہ جاؤں گا؟

میں ضرور سیاہ شیروانی پہن کر تم سے ملنے آؤں گا، اپنے بال پریشان کر کے کیونکہ یہ دونوں چیزیں تمہیں پسند تھیں۔ میں مسکراتا ہوا اٹھا، میں نے سیاہ شیروانی نکال کر پہنی، اپنے بال ماتھے پر پریشان کئے، اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور اپنے عکس کو دیکھنے لگا۔ اس شیروانی میں اب میں کچھ اور طرح کا دکھائی دیتا ہوں میں گھور گھور کر اپنا عکس دیکھنے لگا۔ اتنے غور سے جیسے اپنے آپ کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہوں، میں بدل گیا ہوں اور پھر میرے چہرے کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی، میری مسرتوں پر دھند سی چھا گئی اور وہ نوزائیدہ امنگیں مرجھا کر رہ گئیں، نہ جانے کتنی دیر تک میں اپنے آپ کو اسی طرح کھڑا دیکھتا رہا ـــ کیا یہ وہی معصوم چہرہ ہے جو تمہیں پسند تھا؟ کیا یہ وہی آنکھیں ہیں جن میں محبت جھلملاتی تھی، کیا یہ وہی پیشانی ہے جس پہ پاکیزگی کی جلا تھی۔ کیا یہ وہی شبیہ ہے جو آج سے سات سال پہلے تھی۔ جب ہم آخری مرتبہ ملے ـــ نہیں! ـــ ہرگز نہیں، یہ آنکھیں کچھ ڈراؤنی سی ہیں، ان میں وحشت جھلملا رہی ہے۔ یہ چہرہ کچھ بھیانک سا ہے، یہ ہونٹ اب ملوث ہو چکے ہیں اور یہ پیشانی جس سے ایک مرتبہ تمہارے ہونٹ چھو چکے ہیں اب ایک میلے اور شکستہ آئینے کی طرح ہے، اب میرے دل پر ایک سیاہ خول ہے، جسے مسرت کی کرنیں عبور نہیں کر سکتیں، اب میں

ایک مرجھائے اور روندے ہوئے پھول کی طرح ہوں۔ اور میں کیسا عجیب سا معلوم ہو رہا ہوں، بالکل اجنبی، پہلے سے بالکل مختلف، اور کیا میں اسی طرح تمہارے سامنے چلا آؤں، — تم مجھے پہچانو گی نہیں، تم سہم جاؤ گی، تم مجھ سے نفرت کرنے لگو گی۔

اگر تم اجنبی ہوتیں تو میں بلا دھڑک تمہارے سامنے آجاتا لیکن تم اجنبی نہیں ہو، اگرچہ آج کل تو میں تمہیں اپنا دوست بھی نہیں کہہ سکتا کیونکہ اب تم کسی اور کی ہو چکی ہو، لیکن میرے خیال میں اب بھی میرا تمہارا کوئی رشتہ ہے، خواہ وہ کتنا ہی موہوم کیوں نہ ہو، لیکن کوئی رشتہ ہے ضرور، اسی لیئے میں تمہارے سامنے نہیں آنا چاہتا اور شاید تم اندازہ نہیں لگا سکتیں کہ تمہاری ایک جھلک دیکھنے کے لیئے میری روح کس قدر بے قرار ہے۔ لو اب تمہیں اپنی رام کہانی سناؤں، جب تمہاری شادی ہوئی اُس وقت سے اب تک کی کہانی۔

اس طویل عرصے میں مجھے تم کس قدر یاد آئیں! — یہ میں نہیں بتا سکتا، ایک ایک لمحہ، ایک ایک پل، مجھے تمہاری ضرورت رہی ہے، فقط ایک حسین و جمیل عورت کی نہیں، بلکہ ایک پُر شفقت اور مہربان رفیق کی، ایک نگراں کی، ایک رہنما کی۔

لیکن تم نے مجھے کبھی یاد نہیں کیا، تم نے مجھے ذرا سی امید بھی نہیں دلائی، اگر مجھے فقط اس قدر معلوم ہو جاتا کہ تم نے مجھے اب تک نہیں بھلایا تو میں بالکل ویسا ہی رہتا، ہرگز یہ تبدیلیاں مجھ میں نہ آتیں۔

میں اکثر بہک گیا ہوں، بلندیوں سے نیچے گر گیا ہوں، میں جگہ جگہ ٹھوکریں کھاتا پھرا ہوں، اور میری قسمت نے مجھے اکثر دھوکا دیا ہے۔

لیکن مجھے ہمیشہ تمہارے خط کا انتظار رہا ہے، نہ جانے کیوں، بس ویسے ہی

میں انتظار کرتا رہا۔ خواہ تم کچھ نہ لکھتیں۔ مجھے محبت بھرے فقروں کی ضرورت نہیں تھی، اور نہ ہی میں اپنے زخموں کے لئے مرہم چاہتا تھا، تم مجھے صرف یاد کر لیتیں، خواہ ایک سادے سے پرزے پر اپنا نام لکھ کر بھیج دیتیں۔ میرے لئے وہی کافی تھا۔

اس عرصے میں میری زندگی میں بڑے بڑے طوفان آئے، میرے قدم اکھڑ اکھڑ گئے، میں نے کوئی مدافعت پیش نہ کی، بھلا کرتا بھی تو کس بر تے پر، نہ میرے پاس کوئی سرمایہ تھا اور نہ کوئی امید تھی۔ جدھر ریلا بہا کر لے گیا اُسی طرف بہہ گیا، اور جب کبھی میں تھک ہار کر بیٹھا تو تمہارے خط کا دوبارہ انتظار کرنے لگتا، شروع شروع میں تو سچ مچ مجھے بہت زیادہ خبط رہا، جب ڈاک کا وقت آتا تو میرا دل دھڑکنے لگتا۔ اور جب ڈاک آ چکتی تو کچھ دیر مایوس رہ کر پھر اگلے روز کے لئے امیدیں بندھنی شروع ہو جاتیں۔ یہ امید کمبخت کس قدر ظالم چیز ہے، یہ ہمیشہ ستاتی ہے دل کو سمجھا لو لیکن امید پیچھا نہیں چھوڑتی اور جب مدتوں تک تمہارا خط نہیں ملا تو میں نے سمجھ لیا کہ تم مجھے بھول گئی ہو، اور شاید تمہیں کبھی میرا خیال نہ تھا۔ اس کے بعد میں بے پرواہ ہوتا گیا، نہ مجھے اپنی پرواہ رہی نہ کسی اور کی۔ آہستہ آہستہ اپنے سب اصول بھولتا گیا۔ ہر ایک چیز سے میرا عقیدہ اُٹھ گیا، بھلائی بُرائی سے، رنج اور خوشی سے، دعاؤں سے، یہاں تک کہ بعض اوقات مجھے یقین ہو جاتا کہ اس نیلے نیلے آسمان کے اُوپر ایک خلا ہے جہاں کوئی بھی نہیں ہے، نہ ہمیں کوئی دیکھتا ہے اور نہ ہماری دعائیں وہاں تک پہنچتی ہیں، اگر پہنچ بھی جائیں تو وہاں سننے والا کوئی نہیں ہے، یہ سارا کارخانہ خود بخود چل رہا ہے۔

میں محبت کا بھوکا تھا، جب میں اسے جیت نہ سکا تو میں نے محبت مانگنی شروع کر دی۔ اور کچھ اس طرح کہ بالکل دیوانہ ہو گیا، جب میں نے محبت بھری نگاہوں سے حسین چہروں کو گھورنا شروع کیا تو بہت سی آنکھیں میری طرف دیکھنے لگیں، بہت سی نگاہیں مجھ پر جم گئیں، شاید اس لیے کہ اُن دنوں میری باتوں میں خلوص تھا، میرے چہرے پر بھولا پن تھا اور میری آنکھوں میں معصومیت تھی۔ اور میں محبت کا بھوکا تھا:

میں ہر چمکیلی چیز کو سونا سمجھ کر اُس کی طرف لپکنے لگا، اُس تپتے ہوئے صحرا میں فرضی نخلستان بنا کر اپنے دل کو دھوکا دیا کرتا، اس امید میں کہ کہیں محبت کا سہارا نصیب ہو جائے، شاید مجھے کوئی زندگی کا رفیق مل جائے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور یہی وجہ ہے کہ میں اب تک تنہا ہوں مجھے کوئی ایسی لڑکی نہیں ملی جو مجھے اس قدر محبت دے سکتی جتنی تم نے عطا کی، جو مجھے اتنی مسرتیں اور ہمدردی دے سکتی اور اب تو مجھے سب لڑکیاں ایک جیسی معلوم ہوتی ہیں، خط و خال میں ذرا سا فرق ہوتا ہے، باقی خیالات، گفتگو، باتیں سب ایک جیسی۔ اتنی لڑکیوں میں سے مجھے کسی میں تمہاری ذرا سی جھلک بھی دکھائی نہ دی۔ ویسے مجھے خبط سب کا رہا کسی کا چند ہفتے اور کسی کا محض چند روز۔ بعض اوقات یہ خبط اس قدر عارضی ہوتا تھا کہ جتنی دیر میں کسی سے باتیں کرتا صرف اتنی دیر مجھے اس کا خیال رہتا۔ مجھے طرح طرح کے تحفے ملے، قسم قسم کے نذرانے اور پیش کش، محبت بھی ملی اور نفرت بھی، لگاوٹ بھی اور بے رُخی بھی۔ غرضیکہ میں نے سب کچھ دیکھا۔

اور ایک دفعہ تو میں ایک لڑکی سے کچھ کہنے ہی لگا تھا، تمہارے بعد اگر کسی نے سچ مچ مجھے چاہا ہے تو وہ اُس نے۔ اُس کی محبت بے لاگ تھی۔ اُس نے میری حد سے زیادہ ناز برداریاں کیں، میری ہمت بندھائی، مجھے خوش دیکھنا چاہا۔ اور ایک رات

کو جب نیا نیا چاند درختوں کی اوٹ میں چھپا جا رہا تھا اُس نے اپنے آنسوؤں سے میرا
دامن بھگو دیا، تب میں نے سوچا کہ آج اسے چُن لوں۔ لیکن نہ جانے اُس وقت مجھے
اچانک تمہارا خیال کیونکر آ گیا۔ میں نے اپنے ہونٹ سی لیئے اور ایک لفظ تک نہ کہا۔
شاید وہ رات کی رانی کی مہک تھی، یا نیا نیا نکلا ہوا چاند جس نے تمہاری یاد دلا دی۔
پھر مجھے تمہاری ایک سالگرہ یاد آ گئی۔ اُس روز میں بخار میں تپ رہا تھا۔ ہفتوں سے
بستر میں پڑا تھا۔ مجھ میں چلنے کی طاقت نہ تھی۔ ہمارا راز افشا ہو چکا تھا۔ اِس لیئے مجھے
تمہارے ہاں آنے کی سخت ممانعت تھی۔ شام کو کسی نے مجھ سے کہا کہ آج تمہاری
سالگرہ ہے اور تمہارے ہاں پارٹی ہے، تم نے نہایت پیارا لباس پہن رکھا تھا اور
تم اتنی پیاری معلوم ہو رہی تھیں کہ تمہاری سہیلیاں تمہیں بار بار ٹوکتی تھیں۔ یہ سن کر
جیسے میرے دل میں کوئی چٹکیاں لینے لگا، تمہاری سالگرہ تھی اور تم مجھے بھول گئیں
نہ تم نے مجھے بلاوا بھیجا اور نہ کوئی پیغام۔ میں کچھ دیر کے لئے تم سے روٹھ گیا، لیکن
پھر نہ جانے کہاں سے مجھ میں اتنی ہمت آ گئی کہ میں چپکے سے اٹھا اور کمرے سے
باہر نکل گیا، چوری چوری تمہاری کوٹھی میں پہنچا، وہاں ایک کھڑکی سے جھانک کر
دیکھا، تم اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی تھیں جیسے ستاروں میں چاند تاباں ہو۔
میں دم بخود کھڑا تمہیں دیکھتا رہا، مجھے تم پہلے کبھی اتنی خوبصورت نہیں معلوم ہوئی
تھیں، اور پھر کون سی کشش تھی جو تمہاری نگاہوں کو کھینچ کر کھڑکی تک لے آئی، ہماری
نظریں ملیں، میں نے اشارہ کیا اور تم معذرت کر کے باہر آ گئیں، ہم چپ چاپ اُس
باغ میں چلے گئے جو تمہارے پڑوس میں تھا۔ میں نے تمہاری گود میں اپنا سر رکھ دیا،
نہ جانے کتنی دیر تک ہم دونوں خاموش رہے، پھر تم نے میرا سر اٹھایا اور میری آنکھوں

میں جیسے کچھ تلاش کرنے لگیں، تم دیر تک مجھے اس طرح دیکھتی رہیں، ایک لفظ بھی ہمارے ہونٹوں سے نہیں نکلا، تمہاری آنکھوں میں کتنی ہمدردی تھی، کتنا پیار تھا، پھر تم نے میری پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اُس وقت مجھے یوں محسوس ہؤا جیسے میں ایک ننھّا سا بچہّ ہوں اور ایک معمر خاتون کی گود میں بیٹھا ہوں، جو میری نگراں ہیں، میری رہنما ہیں۔ میں نے تمہاری گود میں اپنا سر چھپا دیا۔ مجھے پاکیزہ ترین چیزوں کی قسم ہے کہ مجھے وہ پُرشفقت بوسہ اب تک نہیں بھولا! اور مجھے وہ لمحے بھی یاد ہیں جب تم زرق برق لباس پہنے میرے سامنے بیٹھی تھیں، تم نے پھولوں کے گجرے اور ہار پہن رکھے تھے، نیا نیا چاند درختوں کی اوٹ میں چھپا جا رہا تھا۔ اور ہوا کے جھونکے سائیں سائیں کر رہے تھے۔

اور بھی بہت سی باتیں مجھے یاد ہیں، ایک مرتبہ جب ہم اُسی باغ میں مل کر واپس چلنے لگے تو تم نے مجھ سے کہا کہ تمہیں میں تمہارے ہاں چھوڑ آؤں، لیکن چونکہ اُن دنوں ہماری ملاقاتوں کا ہر جگہ چرچا تھا اس لیئے میں جھجک کر رہ گیا۔ اور جب تم خداحافظ کہہ کر اکیلی چلی گئیں تو میں بہت پچھتایا، معمولی سی بات تھی، اگر میں تمہیں چھوڑ آتا تو کیا ہرج تھا، تم نے ہی تو کہا تھا، یہ تمہارا حکم تھا، اس کے بعد میں ہمیشہ تمہیں چھوڑنے جایا کرتا، لیکن وہ پچھتاوا بدستور رہا، کاش میں تمہیں ساتھ جا کر چھوڑ آتا، یہ پچھتاوا اب بھی ہے، جب کبھی میں بہت اُداس ہوتا ہوں تو یہی خیال رہ رہ کر دل میں آتا ہے، تمہیں ضرور اس کا رنج ہؤا ہوگا، کاش میں اُس روز انکار نہ کرتا، کاش میں تمہیں چھوڑ آتا۔

اور پھر ایک روز مجھے معلوم ہؤا کہ تمہارا سارا کنبہ کسی تقریب پر گیا ہؤا ہے مجھے

یقین تھا کہ تم ضرور اپنے کمرے میں ہو گی اور تمہیں میرا انتظار ہو گا، اور تم مجھے وہیں ملیں، اپنے کمرے میں۔ لیکن تم سو رہی تھیں، میں نے تمہیں جگایا نہیں، میں نے پہلی مرتبہ تمہارے چہرے کو غور سے دیکھا، اس سے پہلے میں جب کبھی تمہاری طرف دیکھتا تھا تو میری آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں اور ایک پل کے بعد نگاہیں جھک جاتی تھیں، میں فقط ایک جھلک ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس دفعہ میں نے جی بھر کر تمہیں دیکھا، اور نیند میں تم کیسی معلوم ہو رہی تھیں؟ —— جیسے کوئی شریر لڑکی کھیل کود کے بعد تھک کر سو گئی ہو یا کسی محبت کی ماری ہوئی بے قرار روح کی اپنے محبوب کا انتظار کرتے کرتے آنکھ لگ گئی ہو یا جیسے کوئی پُرتمکین اور مغرور ملکہ تخت پر آنکھیں بند کئے کچھ سوچ رہی ہو، اُس وقت میں نے تمہیں طرح طرح کے روپ میں دیکھا، پھر مجھے یاد آ گیا کہ بعینہٖ ایسی تصویریں بچپن میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ امّی کی گود میں آنکھیں بند کر کے یا سوتے میں، لڑکپن میں میرے خوابوں میں اکثر یہی مورت بار بار آئی ہے، اور پھر چپکے سے تم نے آنکھیں کھول دیں، شاید میری نگاہوں کی تپش نے تمہیں بیدار کر دیا، یا تمہیں احساس ہو گیا کہ میں تمہیں دیکھ رہا ہوں، تم مجھے دیکھ کر مسکرائیں، وہ مسکراہٹ میری پتلیوں میں سما کر رہ گئی۔

جہاں تم نے مجھے اتنی مسرّتیں عطا کی تھیں وہاں اگر تم مجھے تھوڑی سی امید بھی دے دیتیں تو میں کبھی نہ بہکتا، اور شاید ساری زندگی اُن مسرور لمحوں کی یاد میں گذار دیتا جو تمہارے قریب بسر ہوئے تھے۔ فقط اتنی سی امید کہ تم مجھے ہمیشہ یاد رکھو گی۔ زندگی کا شکست خوردہ نظریہ مجھے پسند نہیں تھا، مجھے اس کے خیال ہی سے نفرت تھی، میں اس دنیا سے اپنی زندگی کی پوری قیمت وصول کرنا چاہتا تھا، میری تمنّا

تھی کہ ستارے نوچ لاؤں، سمندروں کو ہیرے موتیوں کے لیئے کھنگال دوں، وقت کے سیل کو روک لوں، خود بھی ہنسوں اور دوسروں کو بھی ہنساؤں۔ جتنی نعمتیں اس آسمان کے نیچے ہیں وہ سب مجھے ملجائیں ہیں ناممکن سے ناممکن باتوں کے متعلق سوچتا رہتا تھا۔ لیکن بعد میں یہ نظریہ ختم ہو گیا، پہلے میں بہت حساس تھا، ایک دفعہ میں تمہارے لئے پھول لایا اور تم نے لینے سے انکار کر دیا، شاید اس لیئے کہ میں سب کے سامنے پھول پیش کر رہا تھا، اور مجھے اتنا رنج ہوا کہ ہفتوں میرا چہرہ اُترا رہا۔ لیکن چند سال بعد میں نے ایک نیکلس کسی کو پیش کیا اور جب اُس نے لینے سے انکار کر دیا تو مجھے ذرا سا افسوس بھی تو نہیں ہوا، میں نے وہ ہار سنبھال کر رکھ لیا کہ کسی اور کو دیدوں گا

لیکن تم یہ نہ سمجھنا کہ میرا دل پتھر کا بن گیا ہے۔ جسے اب محبت کا احساس تک نہیں ہوتا، جو شفقت اور ہمدردی کھو چکا ہے —— نہیں۔ اب بھی مجھے محبت ہے —پیار ہے، لیکن اب اس میں فرق آگیا ہے، پہلے میری محبت ایک بہت بڑی جھیل کی طرح تھی جو چاروں طرف سے بند تھی، جس کی لہریں ساحل سے ٹکرا کر واپس آتی تھیں اور خاموش ہو جاتی تھیں، اور اب میری محبت مختلف چشموں میں بہتی ہے، ایسے چشمے جو کبھی خشک نہیں ہوتے ہمیشہ رسیلے نغمے گاتے ہوئے بہتے رہتے ہیں، یہ چشمے کئی ہیں اگر اتفاق سے ان میں سے ایک آدھ سوکھ جائے تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، اب مجھے دکھ سے الفت ہے، بے کسی سے پیار ہے رنج و غم سے محبّت ہے، اب مجھے غمگین داستانیں اچھی لگتی ہیں۔ اب مجھے ویرانے پسند ہیں۔ پہلے صرف حسین چہرے دل کو لبھاتے تھے اور اب پھیکے، اداس

اور اُترے ہوئے چہرے بھاتے ہیں۔ پہلے مجھے صرف تمہیں حاصل کرنے کی آرزو تھی، فقط یہی میری زندگی کا مدعا تھا لیکن اب شاید کوئی شے بھی مجھے مطمئن نہیں کر سکتی، اب ہر وقت ایک بے چینی سی سوار رہتی ہے، ایک ہیجان سا رہتا ہے، ایک تجسس سا۔

پچھلے سال جب میں پہاڑ پر تھا تو ایک رات سخت برفباری ہوئی، مکان درخت سڑکیں سب برف سے سفید ہو گئے، علی الصبح جب میں پوستین میں لپٹا ہوا باہر نکلا تو میں نے ایک شخص کو دیکھا جس کے پاؤں ننگے تھے، اُس نے پیروں پر ٹاٹ باندھ رکھا تھا، معلوم ہوا کہ اُس کے پاس جوتے نہیں ہیں، جتنے روز میں وہاں رہا اس خیال نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا، رہ رہ کر وہی تصویر میرے سامنے آجاتی تھی۔ برف میں ایک ٹھٹھرا ہوا شخص جس کے پاس جوتے نہیں تھے۔ پھر ایک مرتبہ میں نے ہوٹل میں ایک شخص کو دیکھا جس نے بہت قیمتی کپڑے پہن رکھے تھے، لیکن اُس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ ڈرا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ بار بار ایک خط نکال کر پڑھتا تھا اور اُس کا چہرہ زرد ہو جاتا تھا، میں بے چین ہو گیا، کیسا کیسا جی چاہا کہ لپک کر اُس کے ہاتھ سے خط چھین لوں اور وجہ پوچھوں، لیکن میں جھجک کر رہ گیا۔ شاید وہ بُرا مان جائے، اُس شخص کی تصویر میرے ذہن میں اب تک محفوظ ہے۔

اور ایک دن میں نے ایک اندھے بچے کو دیکھا جو اپنی ماں کی گود میں بیٹھا تتلیوں اور پھولوں کے متعلق باتیں کر رہا تھا، بدقسمتی سے وہ ایک مرتبہ دنیا کی جھلک دیکھ چکا تھا، اُس نے طرح طرح کے رنگ دیکھے تھے اور سورج کی روشنی نے اُس کی آنکھوں کو ایک دفعہ منور کیا تھا۔

جب اُس کی ماں نے ایک پھول اُس کے ہاتھ میں دے کر کہا کہ ننھّے اس پھول کا رنگ سرخ ہے، تمہاری ننھی بہن کے ہونٹوں کی طرح۔ تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ اُس کی وہ ہنسی اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے، ایک اندھے بچّے کی ہنسی۔

اور ایک مرتبہ میں نے ایک ضعیف مریض کو دیکھا جسے ڈاکٹروں نے لاعلاج قرار دے کر اُس سے کہدیا تھا کہ وہ ایک مہینے کے اندر اندر مر جائے گا۔ میں اکثر اُس کے کمرے میں جایا کرتا تھا، اُس نے اپنی گھڑی مجھے مرمت کے لیئے دی، اور تاکید کی کہ میں کسی اچھے کاریگر سے مرمت کرا کر لاؤں کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ گھڑی بگڑ جائے۔

ایک شام کو جب میں اُس کے کمرے میں گیا تو وہ کھڑکی سے غروب آفتاب کا منظر دیکھ رہا تھا، اور اس قدر منہمک تھا کہ اُسے میرے آنے کی خبر نہ ہوئی، نہ جانے وہ ڈوبتے ہوئے سورج کو اس طرح کیوں دیکھ رہا تھا، شاید وہ اپنی زندگی کی شام دیکھ رہا تھا، زندگی کی آخری کرن کو ظلمتیں ڈھانپ رہی تھیں، اُسے چاندنی بیحد پسند تھی چاندنی راتوں میں وہ باہر چلا جاتا اور اُسے بمشکل کھینچ کھینچ کر برآمدے میں لاتے تھے جس شام اس کی حالت نازک ہوئی اُسی روز سہ پہر کو وہ آہستہ سے میرے کان میں بولا —— "یہ میری آخری التجا ہے، آج چاند کی چودھویں ہے اور پورا چاند طلوع ہوگا، اور میں اُس وقت تک شاید زندہ نہ رہ سکوں، چاند اُن درختوں میں سے طلوع ہوگا، اگر آج رات میرا بلاوا آجائے تو تم میری آنکھیں بند نہ کرنا۔ اس برآمدے کی چک اُٹھا دینا، آج چاندنی خوب چھٹکے گی۔ اگر میری آنکھیں کھلی رہیں تو میں ضرور دیکھونگا خواہ میرا دل خاموش ہو، میرے ہاتھ پاؤں بے جان ہو چکے ہوں، لیکن آج رات میں چودھویں کا چاند ضرور دیکھوں گا۔" اُسی رات اس کا انتقال ہو گیا، میں نے نہ اُس کا

چہرہ ڈھانپا اور آنکھیں بند کیں، برآمدے کی چک اُٹھادی، درختوں میں سے چودھویں کا چاند طلوع ہو رہا تھا اور وہ سچ مچ دیکھ رہا تھا، اپنی بے نور آنکھوں سے وہ بیجان آنکھیں سچ مچ چاند کو گھور رہی تھیں۔ ایسا نظارہ اگر میں پہلے دیکھتا تو ضرور ڈر جاتا، لیکن اب تو ایسی باتیں میں اپنے دل میں چھپا لیتا ہوں اور انہیں بڑی حفاظت سے رکھتا ہوں۔ شاید میں اب دلیر ہو گیا ہوں۔ زمانے کے تھپیڑوں نے مجھے آداب بتا دیئے ہیں، زندگی کی ٹھوکروں نے مجھے راہ چلنا سکھا دیا ہے۔ اب اگر کوئی مجھے کسی تاریک ویرانے میں چھوڑ دے جہاں تنہائی ہی تنہائی ہو، اوپر سیاہ گھٹا تلی کھڑی ہو اور نیچے کانٹے اور حشرات الارض ہوں، وہاں بھی میں بغیر کسی امید کے زندہ رہ سکتا ہوں۔ کبھی میرے لبوں سے شکایت کا ایک لفظ بھی نہ نکلے گا۔

ویسے کبھی کبھی ایک ننھی سی، موہوم سی امید میرے دل میں آیا کرتی ہے، اور میں سوچا کرتا ہوں کہ — کیا ہوتا جو تم مجھے مل جاتیں، وہ زندگی کس قدر شیریں ہوتی، وہ لمحے کس قدر جانفزا ہوتے، یہ اُداس دنیا نغموں اور مسرتوں سے لبریز ہو جاتی، مانا کہ میں زندگی کا صرف روشن پہلو ہی دیکھ سکتا، لیکن یہ سارا وقت ایک خواب میں گذر جاتا اور ایسے خواب تو کسی کسی کو نصیب ہوتے ہیں یہ خواب تو نایاب ہیں بعض خواب ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو تمام عمر یاد رہتے ہیں، ہم غمگین خواب اکثر بھول جاتے ہیں۔ لیکن مسکراتے ہوئے رنگین خواب ہمیں ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ تب شاید مجھے زندگی کی تلخیوں کا احساس نہ ہوتا۔

یہ خط بہت طویل ہو گیا ہے، تمہیں پہلے بھی مجھ سے یہ شکایت رہتی تھی کہ میں باتونی ہوں، اب یہ طویل خط پڑھ کر بھی یہی خیال کرو گی کہ وہ عادت اب تک نہیں گئی

لیکن یہ سوچنے میں کتنی مسرت ہے کہ تم اس خط کو پڑھو گی، جو میں اپنے قلم سے لکھ رہا ہوں۔ تم سچ مچ ان الفاظ کو پڑھو گی، تمہاری آنکھیں ان الفاظ کو دیکھیں گی، اس خط پر تمہارے چہرے کا عکس پڑے گا۔

کیا میں تم سے ملنے سٹیشن پر آؤں؟ کیا مجھے آنا چاہیئے، اس اجنبی چہرے اور اس مسلے ہوئے پژمردہ دل کو ساتھ لیکر، کیا ان بھکی بھکی نگاہوں سے تمہیں دیکھوں۔ یہ آنکھیں اب اس قابل نہیں رہیں، یہ ہونٹ ملوث ہو چکے ہیں، یہ پیشانی جس پر تمہارے لبوں کا مقدس نشان تھا اب جھوٹی ہو چکی ہے، اور یہ سر جو کبھی بہت مغرور تھا۔ کئی آستانوں پر جھک چکا ہے۔ اب میری باتیں بھی بالکل معمولی سی ہیں، بالکل معمولی اور حقیر تم مجھے دیکھ کر سہم جاؤ گی، کہیں مجھ سے نفرت نہ کرنے لگو۔ اس لئے میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تڑپتا رہوں لیکن تمہارے سامنے نہ آؤں۔ لیکن مجھے اپنی قوتِ ارادی پر اعتبار نہیں ہے، اس لئے میں کل ہی یہاں سے کہیں باہر چلا جاؤں گا، اور اس وقت واپس آؤں گا جب تم یہاں سے گذر چکی ہو گی۔ اگر میں یہاں رہا تو نہ جانے کون سا جذبہ مجھے کھینچ کر تمہارے سامنے لا کھڑا کرے، اور اگر یوں ہو گیا تو زندگی محال ہو جائے گی۔ میں کل ہی کہیں دور چلا جاؤں گا۔ سمجھ لو کہ میں مر چکا ہوں، یا کم از کم وہ روح مر چکی ہے جو تم پر نثار تھی جس کی معصومیت اور جس کا خلوص تمہیں پسند تھا اور اُس نے اپنی مختصر سی حیات میں تم سے اور صرف تم سے محبت کی ہے۔ اور اب میں ایک بیجان جسم لئے پھرتا ہوں، جو بالکل اجنبی ہے، جسے میں بالکل نہیں پہچانتا۔

اب مجھے یہ خط یہیں ختم کر دینا چاہیئے، میں نے ایک نہایت طویل اور بے ربط خط لکھا ہے، اس بے ربطی کی وجہ میرے بے ربط خیالات ہیں، اور شاید یہ خط بالکل

بے معنی ہے۔ جو دماغ میں آیا گیا لکھتا چلا گیا۔

لیکن آخر میں یہ ضرور لکھوں گا کہ دنیا میں اس وقت اگر کوئی چیز مجھے سب سے بڑی مسرت عطا کر سکتی ہے تو وہ تمہاری دید ہے، تمہیں دیکھنے کے لئے میں کس قدر بے قرار ہوں، خدایا! میرے محبوب نے مجھے یاد کیا ہے، میری زندگی، میری روح نے مجھے یاد کیا ہے۔ اگر آج میں وہی پہلا سا بھولا بھالا لڑکا ہوتا جس کے دل میں تم ہی تم ہوتیں جس کے چہرے میں معصومیت کی ذرا سی جھلک ہی ہوتی تو مجھ سا مسرور اس دنیا میں کوئی بھی نہ ہوتا۔ میں سیاہ شیروانی پہن کر تم سے ملنے آتا۔ اپنے ماتھے پر بال پریشان کر کے تم سے طرح طرح کے گلے کرتا، بے رخی اور جدائی کے شکوے ہوتے، اور تمہیں ایک بار جی بھر کر دیکھ لینے کے بعد بقیہ زندگی بھی تمہاری یاد میں گذار دیتا۔ اپنے دل کو نئے نور اور نئی جلا سے بھر لیتا۔

میں اس خط کو پھر طول دیتا جا رہا ہوں۔ اچھا، خدا حافظ۔

محبّت

میں نے اپنا سامان ویٹنگ روم میں رکھوا دیا اور خود پلیٹ فارم پر ٹہلنے لگا، میری ٹرین علی الصبح آتی تھی اور اب رات کے صرف نو بجے تھے، کافی سردی تھی، میں اوورکوٹ لینے اندر گیا کیا دیکھتا ہوں کہ کمار اور شبیر اندر بیٹھے ہیں ـــــ

"ارے! تم کہاں؟"ـــــ

ہم آپس میں مل رہے تھے کہ اتنے میں دروازہ کھلا، دیکھا تو لطیف صاحب چلے آ رہے ہیں ـــــ "نالائقو! تم تینوں کہاں؟" ـــــ خوب قہقہے لگے۔

کتنا عجیب اتفاق تھا، ہم چاروں دوست ایک دوسرے سے دور دور رہنے کے باوجود چند مہینوں کے بعد کہیں نہ کہیں کچھ دیر کے لئے اکٹھے ضرور ہو جاتے تھے اکثر کسی سٹیشن پر ملاقات ہوتی تھی۔

ہم چاروں کی گاڑیاں مختلف تھیں، ہم مختلف سمتوں میں جا رہے تھے، لیکن وہ رات

ہمیں اُن کمروں میں بسر کرنی تھی۔

اب جو باتیں شروع ہوئیں تو کھانے کا بھی ہوش نہ رہا۔ کھانا کھا کر ہم انگیٹھی کے سامنے بیٹھ گئے اور کافی کا دَور چلنے لگا، ہم چھ ماہ کے بعد ملے تھے، ہر ایک اپنی اپنی کارگذاری سنانے لگا، موضوع وہی تھا جو تقریبًا سب نوجوانوں کا مخصوص موضوع ہے ـــ یعنی محبّت۔ آخر طے ہوا کہ ہر ایک باری باری اپنی داستان سنائے، یعنی ان چھ مہینوں کا سب سے رنگین واقعہ۔

پہلے کمار کی باری تھی، ایک سال پہلے کمار کہیں شادی کرنا چاہتا تھا، میں نے اُس لڑکی کو دیکھا، نہایت حسین تھی۔ پھر ہم نے سنا کہ اُس کی شادی نہیں ہو رہی، لڑکی نے انکار کر دیا یا خدا جانے کیا ہوا۔

بشیر بولا۔ "کمار سے کیا پوچھتے ہو، مجھ سے پوچھو، میں اسکی داستان سناتا ہوں، جب سے پشپا نے انکار کیا ہے یہ دن بدن نالائق ہوتا جا رہا ہے۔ کیا تو پہلے اسکی پارسائی اور معصومیت کا دُور دُور چرچا تھا اور کیا اب یہ ہر جگہ پھسل جاتا ہے، ہر ایک کو دیکھ کر آہیں بھرنے لگتا ہے، جن دنوں پشپا اسے اُلّو بنا رہی تھی اُن دنوں ایک لڑکی موہنی بھی اسے چاہتی تھی، لیکن موہنی اور پشپا میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ جتنی پشپا حسین تھی اُتنی ہی موہنی بدشکل تھی۔ میرے خیال میں موہنی میں کوئی جاذبیت نہیں ہے۔ اور یہ پچھلے چار مہینوں سے موہنی کا دیوانہ ہے، دو دو تین تین روز کی چھٹی لیکر، بہانے کر کر کے کسی نہ کسی طرح اُس کے پاس جا ہی پہنچتا ہے، اُسے طرح طرح کے تحفے بھیجتا ہے، ہر روز خط لکھتا ہے، حالانکہ اُس لڑکی سے تو یہ خود کہیں خوبصورت ہے، لیکن نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔"

"کیوں بھئی کمار — ؟" میں نے شکایتاً پوچھا۔

کمار بولا۔ "بھئی سچ پوچھو تو میرا اس محبت وحبت سے عقیدہ اُٹھ گیا ہے۔ میرے خیال میں ہم کسی خاص لڑکی سے محبت نہیں کرتے، بس 'لڑکی' سے محبت کرتے ہیں، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ زندگی میں جو لڑکی سب سے پہلے ملتی ہے۔ ہم اُسی پر مر مٹتے ہیں، اور اُسے یقین دلا دیتے ہیں کہ ہمیں بچپن سے فقط اُسی کا انتظار رہا ہے۔ حالانکہ اُس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تب بھی ہم بالکل وہی باتیں اُس سے کہنے بیٹھ جاتے۔ میں نے موہنی سے بالکل وہی باتیں کی ہیں جو کبھی پشپا سے کی تھیں، ویسے ہی تحفے اُسے دیئے ہیں، وہی ناز برداریاں کی ہیں۔ اور مجھے ذرا سا افسوس بھی نہیں، چند روز ہوئے میں نے پشپا کو دیکھا تھا، مجھے اب اُس کی صورت سے نفرت ہے، وہ مجھے اس قدر بُری معلوم ہوئی کہ میں وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا، اب مجھے محبت سے بھی نفرت ہے، یہ سب ڈھکوسلہ ہے، اس میں حقیقت نام کو بھی نہیں۔ لیکن یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ تمہارا کیا ہؤا؟"

"میں ابھی تک منتظر ہوں۔" میں نے کہا۔

"کس چیز کے منتظر ہو؟ اُن کے خط کے، یا اُن کی توجہ کے؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں، لیکن میں منتظر ضرور ہوں — اور منتظر رہوں گا۔"

"شاباش! اگر تم ایسے چند اور عاشق اکٹھے ہو جائیں تو ایک نئی الف لیلہ تیار ہو سکتی ہے —!" کمار بولا۔

کچھ دیر کی نوک جھونک کے بعد بشیر اپنا قصّہ سنانے لگا۔ "یہ دہلی کا ذکر ہے — سٹیشن پر جب شام کو گاڑی رُکی، تو میری آنکھیں چندھیا گئیں، اُسی وقت ایک

مختلف سمت سے ٹرین آکر ٹھہری تھی، اور عین میرے مقابل ایک بیحد حسین چہرہ کھڑکی میں دکھائی دیا، میں اُسے فقط چند لمحوں کے لیئے دیکھ سکا۔ اُس نے بھی مجھے دیکھا مجھے آگے جانا تھا، اگلی ٹرین میں جگہ نہ مل سکی اور رات کو سٹیشن پر ٹھہرنا پڑا میں ویٹنگ روم میں پہنچا۔ جو دیکھتا ہوں تو وہی چہرہ سامنے ہے جسے میں نے ریل میں دیکھا تھا۔ اُس کے ساتھ اُس کے ابا، امی اور تین چار بہن بھائی تھے۔ وہ مجھے دیکھ رہی تھی، میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا، وہ میز پہ رکھے ہوئے ایک سوٹ کیس کی آڑ لیکر مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک اخبار اُٹھا لیا اور اس کی اوٹ میں ہو کر بے وقوفوں کی طرح اُسے دیکھنے لگا، ہم دونوں کتنی دیر تک اسی طرح ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے، یہ میں نہیں کہہ سکتا۔ اتنی دیر شاید نہ میری آنکھ جھپکی اور نہ اُس کی۔ وہ نہایت ہی حسین لڑکی تھی۔ اُس کے چہرے پر حسن کے علاوہ معصومیت بھی تھی، تمکنت بھی تھی، ایسی حسین لڑکی میں نے مدت سے نہ دیکھی تھی، مجھے شہر میں اپنے عزیزوں سے ملنا تھا لیکن اب وہاں سے اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ مجھ پر ایک نشہ طاری ہو گیا۔ ایسا سرور میں نے کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ کیا کسی طرح اس سے باتیں بھی ہو سکتی ہیں؟ اتنی پیاری لڑکی کی باتیں کس قدر پیاری ہونگی؟ —— لیکن باتیں کیونکر ممکن ہو سکتی ہیں؟ اس کے ابا اور امی جو ساتھ ہیں، اگر میں آج اس سے باتیں نہ کر سکا اور کل ہم جدا ہو گئے تو مجھے عمر بھر اس کا پچھتاوا رہے گا۔ کیا مجھے کوئی موقع نہ مل سکے گا؟ کیا میں پیاسا ہی کنوئیں سے لوٹا دیا جاؤں گا۔

میری پیشانی جلنے لگی، میری آنکھوں کے سامنے آتشیں تتلیاں ناچنے لگیں جیسے کسی نے مجھے شعلوں میں دھکیل دیا ہے —— میں نے تہیہ کر لیا کہ آج اسے ضرور ملوں گا، خواہ کچھ بھی ہو جائے، اور پھر اس واقعے کو میں ایک حسین یاد بنا کر اپنے دل

میں محفوظ رکھوں گا۔

وہ سب ڈائیننگ روم میں کھانا کھانے چلے گئے۔ میں ذرا سے وقفے کے بعد گیا لیکن وہاں اتنی بھیڑ تھی کہ میں اُس کے قریب نہ بیٹھ سکا۔ جب میں واپس آیا تو دیکھا کہ وہ سب پکچر جانے کی تیاری کر رہے ہیں، کسی سنیما میں سیکنڈ شو دیکھنے جا رہے ہیں، وہ بھی تیار معلوم ہوتی تھی۔ میں اُسی کرسی پر بیٹھ گیا اور آنکھوں میں التجائیں کرنے لگا، میری نگاہیں اُس سے کہہ رہی تھیں ـــــ کاش تم یہاں ٹھہر جاتیں، کاش تم اِن کے ساتھ نہ جاتیں، پھر ہم نزدیک بیٹھ کر ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھتے، اور اُس وقت اگر ہمیں تنہائی میسّر ہوتی تو میں اُس کی گود میں سر رکھ دیتا اور کہتا کہ اے میری روح مجھے تجھ سے محبّت ہے۔

دفعتاً اُس نے اپنی امّی سے کچھ کہا، وہ معذرت کر رہی تھی ـــــ میرے سر میں شدید درد ہے امّی، مجھے وہاں ذرا لطف نہ آئے گا۔ بلکہ آپ سب کو ناحق پریشان کروں گی۔ پہلے تو وہ لوگ نہ مانے، اُس کے ابّا اُسے مجبور کرتے رہے، لیکن وہ مصر رہی۔ میں باہر آگیا شاید اُس وقت میری موجودگی اُنہیں ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔ میں بے قراری اور انتظار کے عالم میں باہر ٹہلنے لگا، حتےٰ کہ میں نے انہیں باہر نکلتے دیکھا، اُس کے ابّا، امّی، دو بچیاں، ایک چھوٹا لڑکا ـــــ بس! تو گویا وہ نہیں جا رہی! . . . . میرا دل بے تحاشہ دھڑکنے لگا۔ میرے ہونٹ سوکھ گئے، میرے اللہ، اب میں بارگاہِ حسن میں کیا نذرانہ لیکر جاؤں؟ میں کیونکر وہاں حاضر ہونگا اُس حسین شعلے کے نزدیک کیونکر جاؤں، جھجک تھی، ڈر تھا، رعب طاری تھا جب اندر گیا تو وہ میری منتظر تھی، ہم دونو مسکرائے، وہ بدستور مجھے دیکھ رہی تھی لیکن

اب اُن نگاہوں میں ڈر بالکل نہیں تھا۔ ہم دونوں وہاں اکیلے تھے۔ باہر نوکر، قلی اور بیرے بھاگتے پھر رہے تھے، اُن کا شور مخل ہوتا تھا۔

میں نے کہا — "چلئے باہر چلیں۔"

"کہاں؟" اُس نے پوچھا۔

"میں بتاتا ہوں —!" میں اُسے برآمدے میں لے گیا — "وہ دیکھئے سڑک کے اُس پار وہ جو باغ ہے وہاں —!"

"اور جو ابّا آ گئے تو —؟" اُس نے پوچھا۔

"ابّا بارہ بجے سے پہلے نہیں آئیں گے، اور ہم اس سے پہلے واپس آ جائیں گے۔"

اُس نے کچھ اس انداز سے مجھے دیکھا کہ اُس کی نگاہیں دل کو چیرتی ہوئی چلی گئیں ذرا سی دیر میں ہم سیڑھیاں اُتر رہے تھے۔ سڑک کو عبور کر کے ہم باغ میں پہنچے۔ اگرچہ وہاں روشنی کافی تھی لیکن شور کم تھا، آخر ہمیں ایک تنہا سا گوشہ مل گیا، ہم دونوں بیٹھ گئے، ہم نے وہاں دو گھنٹے گذارے، خوب باتیں ہوئیں، بار بار ایک دوسرے سے محبت کا اظہار کیا، اپنی بے انتہا محبت کا یقین دلایا، اس قدر دلآویز لمحے میری زندگی میں پہلے کبھی نہ آئے تھے، قدرت مجھ پر اتنی مہربان کبھی نہ ہوئی تھی۔ شاید وہ اپنی زندگی سے مایوس تھی، یا اُس نے کوئی چوٹ کھائی تھی، یا اُسے میں بیحد پسند آ گیا، یا ماحول ہی کچھ ایسا تھا، سفر میں ایک مختصر سا قیام، ایسے عجیب حالات میں ملاقات، جگمگاتے ہوئے قمقموں کے نیچے نگاہوں کے پیغام، اور پھر لڑکپن، اور لڑکپن کی حماقتیں جب ہم دونوں پودوں میں گھرے ہوئے بیٹھے تھے تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اس پر بُری طرح عاشق ہو گیا ہوں، میں اس سے دیوانہ وار محبت

کرتا ہوں، میں اس کے بغیر اب ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اُدھر وہ بھی مجھے ایسی ہی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی، ایسی کھوئی کھوئی نگاہوں سے جیسے وہ سب کچھ ہار بیٹھی ہے اچانک ہمیں وقت کا خیال آگیا اور ہم فوراً لوٹ آئے، میں اُسے چھوڑ کر باہر چلا گیا، ذراسی دیر کے بعد اُس کے ابّا اور امّی وغیرہ آگئے، میں نے کچھ دیر انتظار کیا پھر اندر گیا اور سو رہا۔ علی الصبح اُٹھتے ہی سامان کی فکر پڑی، گاڑی کا وقت اپنی نشست کا خیال ـــــ کچھ ایسی گڑبڑ مچی کہ میں اسے دیکھ نہ سکا۔ جب میں ٹرین میں بیٹھا روانگی کا منتظر تھا تو میری نگاہیں سامنے کھڑی ہوئی ٹرین کی طرف چلی گئیں، اور ایک کھڑکی میں جم کر رہ گئیں، وہی چہرہ مجھے دیکھ رہا تھا، ہم دونوں مختلف سمتوں میں جا رہے تھے، چند لمحوں کے بعد ہم جدا ہو گئے، دفعتاً مجھے ایک ایسا خیال آیا جس نے مجھے غمگین کر دیا ـــــ میں نے اس کا پتہ بھی نہ پوچھا ـــــ اُفوہ کتنی بھول ہوئی اور اپنے متعلق بھی تو اسے کچھ نہ بتایا ـــــ لیکن بتانے سے کیا فائدہ ہوتا، شاید اب کبھی ایسا اتفاق نہ پیش آئے، اور ہم مختلف سمتوں میں جاتے ہوئے ایک دوسرے کے قریب سے پھر کبھی نہ گذریں۔ جب شام کو میں لاہور پہنچا تو سب کچھ بھول چکا تھا رات کے واقعات دھندلے پڑتے جا رہے تھے۔ جو کچھ گذرا تھا اُس کی حقیقت پر شبہ ہو چلا اور اگلے روز ایمان کی قسم مجھے یہ یقین ہو گیا کہ میں نے ایک خواب دیکھا ہے اس کے بعد مجھے کبھی وہ لڑکی یاد نہیں آئی، کتنی عجیب بات ہے، جب ہم ایک دوسرے کے پاس بیٹھے تھے تو میں نے قسمیں کھائی تھیں کہ میں اُس سے محبّت کرتا ہوں۔ اور کرتا رہوں گا، وعدے کیے تھے کہ اُسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ اور اس کا پتہ تک نہیں پوچھا ـــــ شاید اس عمر کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے ـــــ پانی کے بلبلے

کی طرح ناپائیدار — بالکل خواب کی طرح — !"

کمار نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور بولا — "ماں بیٹے اور بھائی بہن کی محبت کو چھوڑ کر مرد صرف مرد سے محبت کر سکتا ہے اور عورت عورت سے، لیکن مرد اور عورت کی محبت بالکل ناپائیدار ہے، بالکل وقتی چیز ہے، جس کی بنیاد ہی چند کمزور جذبوں پر ہو اُس میں استقلال کہاں سے آسکتا ہے — ایسی ہی محبت لطیف کو بھی تو تھی۔"

"ارے ہاں یار۔" بشیر بولا۔ "پچھلے مہینے میں نے انور کو دیکھا — !"

"اب کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ویسی ہی ہے، شاید پہلے سے زیادہ حسین ہو گئی ہے، لطیف بیچارے نے تو اُسے ایک عرصے سے نہیں دیکھا، کیوں لطیف؟"

"ہاں! — مجھے ڈیڑھ سال ہو چکا ہے، لیکن اب مجھے دیکھنے کی پروا بھی نہیں۔"

"شاباش! اب بنے ہو تم انسان" کمار بولا۔ "ورنہ وہ دن بھی تو تھے جب جناب امتحان میں پرچے چھوڑ چھوڑ کر بھاگ جایا کرتے تھے اس لئے کہ انور کسی سینما میں میٹنی دیکھنے آئی ہے۔ کوئی یونہی جھوٹ موٹ کہدے کہ ہم نے انور کو فلاں جگہ دیکھا تھا، بس لطیف صاحب کے پیٹ میں چوہے دوڑنے لگتے، سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو جاتی، کب دیکھا تھا؟ — ساتھ کون کون تھا؟ کیسا لباس پہن رکھا تھا؟ کیسی دکھائی دے رہی تھی، گلے میں وہ ہار بھی پہن رکھا تھا یا نہیں، بائیں ہاتھ کی تیسری اُنگلی میں کوئی انگوٹھی تو نہیں پہن رکھی تھی۔ یہ اور وہ!"

"تب اور بات تھی!" لطیف بولا "تب بچپنہ تھا، اب زمانے کی ٹھوکروں نے بہت کچھ سکھا دیا ہے، وہی بے وقوف اور پگلا سا دل جو کبھی بے حد حساس تھا۔ اب سمجھدار ہوتا جا رہا ہے۔"

"اب تک ہم یہی سنتے آئے ہیں!" کمار بولا "کہ محبت ایک طویل رفاقت کے بعد پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھ کر، ایک دوسرے کی خوبیاں اور کمزوریاں دیکھ کر، ایک دوسرے کو اچھی طرح پرکھ چکنے کے بعد محبت پیدا ہوتی ہے لیکن یار لطیف تمہیں کس قسم کی محبت تھی؟ کیا تم نے آج تک کبھی انور سے گفتگو کی؟"

"نہیں تو! اگر اتفاق سے فون پر وہ کبھی بول پڑی ہو تو مجھے پتہ نہیں ویسے میں نے کبھی اُس سے گفتگو نہیں کی۔"

"کبھی اُس نے کوئی اشارہ کیا جس سے تمہیں یقین ہوا ہو کہ اُسے تمہارا خیال ہے؟"

"کبھی نہیں! یہ دوسری بات ہے کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہو، ورنہ اُس نے آج تک مجھے پسند نہیں کیا، شاید اُسے مجھ سے نفرت تھی۔"

"پھر تمہیں اُس سے محبت کیوں تھی؟ میں نے سنا تھا کہ اُن کے گھر میں تمہارا آنا جانا پسند نہیں کیا جاتا تھا جب تم فون کرتے تھے تو تمہاری آواز سن کر فون بند کر دیا جاتا تھا، اُس گھر میں بچے سے لیکر بزرگ تک سب تمہیں ناپسند کرتے تھے، پھر تمہیں اُس سے کیوں محبت تھی؟"

"معلوم نہیں، — میں بتا نہیں سکتا، پہلے پہل اپنی حماقتوں کا خیال کر کر کے اکثر میں پشیمان ہوا کرتا تھا لیکن اب مجھے کسی کی پروا نہیں، اب میں نے سب کچھ بھلا دیا ہے، اب میں کسی انور کو نہیں پہچانتا۔"

"اور تم وہاں شادی کرنا چاہتے تھے؟"

"ہاں! کچھ دنوں یہ خبط بھی مجھ پر سوار رہ چکا ہے۔"

"تمہیں وہ گھرانا پسند تھا؟ صاف بتانا —!"

"نہیں!"

"تمہیں اُس کے ابّا اچھے لگتے تھے کیا؟"

"ہرگز نہیں! مجھے اُس کے ابّا سے سخت نفرت تھی، وہ بیحد باتونی ہیں اور پھر وہ موٹے کس قدر ہیں، سارا دن صوفے پر بیٹھے رہتے ہیں، صبح سے شام تک بس باتیں ہی باتیں کرتے رہتے تھے، سب سے زیادہ فلاسفی پر گفتگو ہوتی تھی، میں نے فلاسفی کا ایم۔اے کیا ہے اور انہیں اس کے متعلق ایک حرف بھی معلوم نہیں پھر بھی وہ زبردستی مجھے ہرا دیتے تھے، مجھے اُن کی کوئی بات بھی پسند نہیں تھی۔"

"اور انور کے بھائی؟"

"انور کے دونوں بھائیوں سے مجھے نفرت تھی، دونوں پرلے درجے کے بے وقوف ہیں، بعض اوقات تو میں اُنہیں پاگل سمجھتا تھا، میں کہہ تو رہا ہوں کہ مجھے اُس کنبے میں سوائے انور کے سب سے نفرت تھی۔ مجھے اُس کوٹھی سے نفرت تھی۔ اُس باغ سے نفرت تھی، آسمان کے اُس حصے سے نفرت تھی جو اُس کوٹھی کے عین اُوپر تھا۔ وہ سارا کنبہ بے حد مغرور اور فضول سا تھا۔"

"تم سا خود دار لڑکا اُن دنوں کالج میں نہیں تھا، تم نے یہ مصیبت مول لے کر اپنی خودداری کھوئی، بدنام ہوئے، اتنے پریشان رہے، غرضیکہ اپنی اس عجیب و غریب محبت میں تمہیں نقصان ہی اٹھانا پڑا، اس کا ذرا سا بھی تو فائدہ نہیں ہوا

تمہیں۔ اب چونکہ تم نے اپنی رائے بتا دی ہے اس لئے میں اپنے خیالات ظاہر کرنے سے نہیں جھجکتا۔ مجھے وہ گھرانا نہ کبھی پسند تھا اور نہ ہے، انور اتنی اچھی نہیں جتنی تم سمجھتے رہے ہو۔ چونکہ تم نے اُسے دور سے دیکھا ہے اِس لئے تمہیں اُس کی خامیوں کا علم نہیں ہے، میری بہن رتن انور کی سہیلی ہے، وہ اکثر اُس کا ذکر کرتی رہتی تھی، انور سے شادی کرنا بہت مہنگا سودا تھا، اور تمہیں یہ کبھی راس نہ آتا، تم غالباً اُس کے رنگ پر مرمٹے تھے، اور یہ گلابی یا سنہرا رنگ بالکل عارضی چیز ہے، شاید تم نے اُس کی تنگ پیشانی نہیں دیکھی، اُس کے غیر شاعرانہ ہونٹ نہیں دیکھے، اُسے چلتے ہوئے نہیں دیکھا، تم نے یہ نہیں دیکھا کہ وہی انور ساڑی پہن کر کتنی معمولی سی لڑکی معلوم ہوتی ہے۔ تم نے اُسے رنگین دوپٹوں اور شوخ قمیصوں میں دیکھا ہے۔ اُس کی شکل کے علاوہ تمہیں اور کوئی لالچ نہیں تھا، تمہیں اُس کا کنبہ ناپسند تھا، وہ گھرانا بالکل معمولی ہے، پھر تم نے اُس سے کبھی بات تک نہیں کی، اور وہ تمہیں پسند بھی نہیں کرتی تھی —— یہ سب کچھ جانتے ہوئے تمہیں اُس سے کیوں محبت کی تھی؟"

"بھئی حماقتیں ہر کوئی کرتا ہے ——!" لطیف بولا۔ "جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اب تو میں کبھی کا سنبھل چکا ہوں۔ اب ایسی کوئی کمزوری میرے دل میں نہیں رہی جب میں وہاں سے روانہ ہوا تو میں دل ہی دل میں اُس گھڑی کو کوس رہا تھا، جب میں نے انور کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا، کاش میں اُسے بالکل نہ دیکھتا۔ لیکن اب یہ سب بے معنی ہے۔ اب مجھے نہ کسی انور کی پرواہ ہے، نہ میرے سینے میں وہ کمزور سا دل ہے، نہ میں اپنی حماقتوں پر پشیمان ہوں، اس تجربے نے مجھے سخت بنا دیا ہے پچھلی مرتبہ جب میں لاہور سے گذرا تو بغیر وہاں ٹھہرے سیدھا چلا گیا، یہ تو آج تم

نے یاد دلا دیا ورنہ میں تو اس قضیئے کو کبھی کا بھول چکا ہوں۔ اب مجھ میں وہ خودداری واپس آ گئی ہے، اب میں وہی مغرور لطیف ہوں، مجھے اب کسی کی بھی پروا نہیں ہے۔"

"اوہ! بارہ بج چکے ہیں — صبح چار بجے اٹھنا ہے۔" بشیر بولا۔ "بھئی میں اور کمار تو سوتے ہیں، کمار کی گاڑی ساڑھے چار بجے آتی ہے۔"

"بہت اچھا! لیکن صبح ہمیں جگا لینا۔ کہیں چپ چاپ ہی دفع ہو جاؤ۔" میں نے کہا

"تم بے فکر رہو، ہم تمہیں کان پکڑ کر اٹھا لیں گے۔" کمار بولا۔

شب بخیر کہہ کر کمار اور بشیر دوسرے میں سونے چلے گئے۔

میں اور لطیف دونوں انگیٹھی کے سامنے بیٹھے سگریٹ پی رہے تھے۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر لطیف نے اپنی کھینچ کر میرے قریب کر لی اور آہستہ سے میرے کان میں بولا۔ "یہ سب کچھ درست ہے، جتنی باتیں ہوئی ہیں یہ سب صحیح ہیں، لیکن ان سب کے باوجود مجھ میں ایک کمزوری بدستور ہے، اس سینے میں اب کوئی کمزور یا ڈرپوک دل نہیں دھڑکتا، اب اس میں ایک نڈر اور بے پروا دل ہے ٹھوکروں اور تجربوں نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے، اب مجھے اپنے خیالات پر قابو ہے، اپنے دماغ پر قابو ہے۔ لیکن اگر آج انور مجھ پر مہربان ہو جائے تو میں اس کے قدموں میں جھک جاؤں، اگر آج وہ مجھے کوئی حکم دیدے تو اس کی تعمیل کے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہوں۔ اگر اس کے ہونٹوں سے میرے لئے ایک پیار بھرا بول نکل جائے تو میں پل بھر میں ویسا ہی خبطی اور بے وقوف بن جاؤں گا۔ اگر وہ ذرا سا بھی پیغام مجھے بھیجدے یا ایک خط ہی لکھدے تو میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں جا پہنچوں، اور انور کے وہی باتونی ابا، اس کا وہی

مغرور کنبہ وہ بھیانک سی کوٹھی ـــــ وہ سب مجھے اچھے معلوم ہونے لگیں۔ اور یہ کمزوری ساری عمر رہے گی۔ میں اپنا سینہ چیر کر اس دل کو نوچ کر باہر پھینک سکتا ہوں لیکن دل سے اس کمزوری کو نہیں نکال سکتا۔ کچھ ایسی ہی عجیب چیز ہے یہ کمبخت محبت ـــــ"

اور ہماری نگاہیں انگیٹھی پر جمی ہوئی تھیں جہاں لپکتے ہوئے شعلوں کی جگہ اب راکھ اور چنگاریاں باقی رہ گئی تھیں، لیکن تپش بدستور رہتی۔

تحفے

میں یہ دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ اتنے سارے آدمی کہاں سے آ گئے، کوئی ایسا بڑا میچ بھی نہیں تھا، بس اتوار کا دن تھا اور شام کا وقت، غالباً شہر بھر میں کرکٹ کا میچ صرف ہم لوگ ہی کھیل رہے تھے۔ یہ میچ ہر سال کلب کے وسیع میدان میں ہوتا تھا، دور سے ٹیم آتی تھی۔ اور تین روز تک کھیلا جاتا تھا۔ میں پہلی مرتبہ اس ٹورنمنٹ میں کھیل رہا تھا، چاروں طرف بے شمار آدمی کھڑے ہمیں دیکھ رہے تھے اُن آدمیوں کے پیچھے بھی آدمی ہی تھے اور اُن کے پیچھے بھی آدمی، غرضیکہ لاتعداد آدمی جمع تھے۔

میچ کا تیسرا دن تھا، ہمارے حریف آخری اننگ کھیل رہے تھے۔ سکور یہ تھا کہ یہ سب کچھ ملا کر اُنہیں جیتنے کے لئے صرف چالیس رنز درکار تھیں۔ اُن کے پانچ

کھلاڑی باقی تھے اور ابھی کھیل ختم ہونے میں کافی دیر تھی۔ ایک صاحب چھتر رنز بنا چکے تھے اور ہمارے بولرز کی خوب مرمت کر رہے تھے، غالباً اپنی سو رنز مکمل کرنے کی فکر میں تھے۔

اور میں باؤنڈری لائن پر کھڑا کلب کے ممبروں سے باتیں کر رہا تھا، کوئی گیند اتفاق سے آگئی تو اٹھا کر پھینک دی، اور گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ کلب کے سب ممبر آئے تھے، اس لئے کہ ایک تو ہمارے میدان میں میچ ہو رہا تھا۔ دوسرے یہ کہ کلب کے دو ممبر بھی مقامی ٹیم کی طرف سے کھیل رہے تھے، ایک میں اور ایک 'ف' صاحب۔ ہم دونوں کو غلط فہمی تھی، میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب مجھے دیکھنے آئے ہیں اُدھر وہ خوش تھے کہ اُن کا کھیل دیکھ دیکھ کر لوگوں کا بُرا حال ہے غلط فہمی کی اصلی وجہ لڑکیاں تھیں، سب کی سب موجود تھیں، لیکن 'ف' صاحب نہ جانے لڑکیوں کو دیکھ کر کیوں گھبرا رہے تھے، کیونکہ اُنکی اپنی لڑکیاں بھی وہاں موجود تھیں۔

خیمے کے نیچے بڑی رونق تھی "ع" کی سفید فریم کی سیاہ عینک دُور سے نظر آ رہی تھی۔ "ب" اپنی چمپئی اوڑھنی کو بار بار سر سے اُتار رہی تھیں، اور پھر یکایک اوڑھنی اُن کے سر پر نہ جانے کیونکر جا پہنچتی تھی۔ 'ط' ضرورت سے زیادہ مسکرا رہی تھیں، اور 'م' ن کرسی چھوڑ کر میز پر محض اس لئے بیٹھی ہوئی تھیں کہ سارا ہجوم اُن کے کٹے ہوئے بالوں کے درشن کر لے۔ اور 'ص' صاحبہ کے دل میں نہ جانے رہ رہ کر کیا ولولہ اُٹھتا تھا وہ اچھل اچھل کر کھلاڑیوں کی تعریفیں کر رہی تھیں۔

مسٹر اور مسز حسن بالکل میرے قریب بیٹھے تھے، مسٹر حسن کبھی کبھی میری طرف ٹافی پھینکتے جسے میں بڑے خوبصورت سٹائل سے کیچ کرتا۔ کھیل میں میرا ذرا دھیان

نہیں تھا، کیونکہ میچ شروع ہونے ہی کپتان سے میری اَن بن ہوگئی تھی۔ میں فاسٹ بولر تھا اور ہمیشہ شروع شروع میں بولنگ کیا کرتا تھا۔ کپتان نے نہ جانے کس مسخرے سے بولنگ شروع کرائی جس کی خوب مرمت ہوئی۔ جب گیند کی چمک اُڑ گئی تب کپتان نے میری طرف گیند پھینکی، میں نے چند اوور کیئے، کچھ نہ بنا۔ کپتان صاحب ناراض ہو گئے کہ میں جان بوجھ کر بے دلی سے گیند پھینک رہا ہوں آخر مجھ سے گیند لے لی گئی اور دوسری اننگ میں مجھے بالکل نہ پوچھا گیا۔ کلب کے سب ممبر مجھ سے بار بار کہتے تھے کہ بھئی ذرا دو ہاتھ دکھاؤ، میں نے بہانہ کر رکھا تھا کہ بازو میں موچ آگئی ہے

ر ع، نے چاکلیٹ کا ایک ٹکڑا میری طرف پھینکا جسے میں نے لپک کر کیچ کر لیا اور خوب تالیاں بجیں، ہمارے کپتان صاحب جل کر کوئلہ بن گئے ہوں گے، وہ میری طرف دیکھ تو رہے تھے۔ لیکن مجھ سے اس قدر بیزار ہو چکے تھے کہ کچھ نہیں کہا۔

ارے! یہ ' ن، کے ساتھ کون بیٹھا ہے؟ — خوب ہے! کیا شان ہے، چہرہ کیسا دمک رہا ہے، اور آنکھیں کتنی نشیلی ہیں، غالباً یہ کلب میں نئی آئی ہیں — ان سب لڑکیوں سے حسین ہیں — اور یہ غل — لینا پکڑنا — یہ کیا مصیبت آئی، میں گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا، کیا لینا؟ کیا چیز ہے؟ — کیا کہہ رہے ہیں یہ سب، — اُدھر لوگ چلا چلا کر مجھ سے کہہ رہے تھے — لینا شاباش پکڑنا — میں بوکھلا گیا — یہ بات کیا ہے؟ — ہجوم چلا رہا تھا — شاباش باؤنڈری لائن پر — پکڑنا۔ میں گھبراہٹ میں باؤنڈری لائن کی طرف بھاگا — شوں سے ایک گیند۔ قریب سے گذری اور میں نے لپک کر پکڑ لی —

مجھے کافی اچھلنا پڑا لیکن میں نے ہوا ہی میں اُسے دبوچ لیا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ آخر یہ گیند کس نے پھینکی تھی۔ اُدھر چاروں طرف سے لوگ چیخیں مارنے لگے، میں نے کھلاڑیوں کو بڑے غور سے دیکھا، آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ ایک کھلاڑی بلا سنبھالے واپس جا رہا تھا، ارے! یہ تو آؤٹ ہو گیا۔ کس نے آؤٹ کیا اسے؟ اور یہ ہوا میں اڑتی ہوئی گیند — لاحول ولا قوۃ! تو گویا میں نے کیچ کیا تھا۔ یکلخت مجھے معلوم ہوا کہ میں نے کمال کر دیا ہے، ایک نہایت ہی مشکل کیچ کیا ہے۔ کپتان نے بھی تعریف کی۔ میں نے بورڈ کی طرف دیکھا۔ جیتنے کے لئے انہیں صرف دس رنز درکار تھیں۔ اور ابھی اُن کے چار کھلاڑی باقی تھے۔ ایک لمبے قد کے حضرت بلا لئے وکٹوں کی طرف جا رہے تھے، اور دوسری طرف وہ بیٹسمین کھڑا تھا جس کا سکور اب پچاسی تھا۔

بولر نے گیند پھینکی، اور نئے کھلاڑی نے آگے بڑھ کر استقبال کیا، اور گھما کر وہ رسید کی کہ گیند درختوں کے اُوپر سے گذر گئی، نہایت عالیشان "چھکا" لگا غضب خدا کا! فقط چار رنز باقی رہ گئیں۔

اوور ختم ہوا۔ دفعتاً کسی نے میرا نام پکارا۔ چونک کر دیکھا کپتان بلا رہے تھے اُن کے ہاتھ میں گیند تھی، انہوں نے پھر ایک نعرہ لگایا اور ہاتھ سے اشارہ کیا۔ میں حیران ہو کر وکٹوں کی طرف چل دیا، ہجوم نے مختلف قسم کی آوازیں آئیں مسٹر اور مسز حسن نے تالیاں بجائیں اور خیمے کے نیچے سب خواتین و حضرات تالیاں بجانے لگے، اُن چلا رہے ہیں — شاباش! ہو جائے ایک ہیٹ ٹرک۔

کپتان نے گیند میرے ہاتھ میں دیدی، اب سکور یہ تھا کہ اُنہیں جیتنے کے لئے

چار رنز اور برابر رہنے کے لئے تین رنز درکار تھیں۔ اور ابھی چار کھلاڑی باقی تھے میں نے دل میں سوچا کہ اب ایک "چوکا" لگے گا اور میچ ختم۔ میرے سامنے وہ مولنا بلا لئے کھڑے تھے جن کا سکور پچاسی تھا۔ بھلا یہ کہیں بخشیں گے۔ میں نے فیلڈ لی اور ٹھنڈے پانی کے ایک گلاس کی درخواست کی جو ہمارے کپتان نے نامنظور کر دی۔ عجب تماشہ ہے اب ہارتے وقت مجھے بلانے کا مطلب؟ سوچا ہوگا کہ چلو اسکی ہنسی اڑواتے ہیں۔ میں نے قدم گنے، اور ہجوم کی طرف دیکھا۔ اچھا! ـــــ اب یہاں یہ عرض کر دینا میرا فرض ہے کہ میں بہت اچھا بولر نہیں ہوں اگر میں بریڈمین یا ہیمنڈ کو سامنے کھڑا کر کے ساری عمر بولنگ کرتا رہوں تب بھی انہیں آؤٹ نہیں کر سکتا، یہ اور بات ہے کہ وہ تنگ آ کر خود ہی آؤٹ ہو جائیں ـــــ میں ہجوم کی طرف دیکھ کر بالکل نہیں گھبرایا۔ گھبراتا تو تب جب جیتنے کی کوئی امید ہوتی، یہاں تو معاملہ بالکل چوپٹ تھا، اُدھر وہ پچاسی رنز والے حضرت سامنے کھڑے مجھے گھور رہے تھے۔

میں نے بھاگنا شروع کیا، بے تحاشا بھاگا، وکٹوں کے ادھر سے ایک زبردست چھلانگ لگائی اور پورے زور سے گیند پھینکی، اُس نے ایک نہایت خوبصورت کٹ مارا اور بھاگا۔ ہمارے ایک فیلڈر نے گیند روک لی، اور اب وہ نئے صاحب میرے سامنے کھڑے تھے، اور جیتنے کے لئے اُنہیں صرف تین رنز درکار تھیں۔

میں نے دوڑ لگائی، اس دفعہ نہایت تیزی سے گیند پھینکی، انہوں نے آگے بڑھ کر بڑی اُستادی سے گیند کو کھیلا، لیکن گیند اُونچی رہ گئی، اور شپ سے سلپ میں پکڑ لی گئی۔ میدان تالیوں سے گونج اٹھا۔ وہ صاحب واپس جا رہے تھے۔ اب تین کھلاڑی رہ گئے ـــــ اور تین رنز۔ توبہ کرو ـــــ میں نے دل سے کہا، دھڑ کنے وڑ کنے کی کوئی

ضرورت نہیں ہے۔ شکر کرو کہ ایک وکٹ تو ملی، عزّت رہ گئی۔ اب ایک نہایت ہی بے ڈھنگی قسم کے کھلاڑی تشریف لائے۔ انہوں نے نہ چاک سے نشان لگایا نہ کچھ اور بلّا لے کر اس انداز سے کھڑے ہو گئے۔ گویا کہہ رہے ہوں کہ ابھی سمجھتا ہوں تجھ سے ذرا آ تو سہی۔ میں بھاگا، وکٹوں کے پاس پہنچ کر یکلخت آہستہ ہو گیا، اور ایک بار کر پھینکا (یارکر وہ گیند ہے جو بلّے کے عین نیچے پڑتی ہے) اُدھر وہ صاحب آگے بڑھے اور یا علی کہہ کر جو بلّا گھمایا ہے تو گیند نیچے سے نکل گئی اور وکٹ اُڑ گئی، اور ہجوم نے اس مرتبہ وہ غل مچایا کہ کان بہرے ہو گئے۔

اب میں گھبرایا، دو کھلاڑی باقی ہیں اور جیتنے کے لئے اُنہیں تین رنز چاہئیں۔ مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں —— پھر بھی کوشش کرو، لیکن کوشش کیا خاک کرو اگر کسی نے ایک 'چوکا' لگا دیا تو معاملہ صاف ہے۔ یہ چھپاسی ناٹ آوٹ والے صاحب اس طرف کھڑے دانت پیس رہے ہیں، اگلے اوور میں یہ پہلی ہی گیند پر چھکا لگائینگے۔ میں نے خیمے کی طرف دیکھا۔ ن، کی نیلی ساری نظر آ رہی تھی، اور 'ب' کی چمپئی اوڑھنی بھی۔ اُن نئی خاتون کا چہرہ بُری طرح دمک رہا تھا۔ میری کنپٹیاں تمتما گئیں۔ پسینہ آ گیا۔

اور جو کہیں یہ دو وکٹیں بھی —— پاگل ہوئے ہو حضرت میں نے دل میں کہا اب ایک موٹے تازے سانڈ تشریف لائے، مجھے اس طرح گھور رہے تھے جیسے کچّا ہی چبا جائیں گے، انہوں نے اپنا بلّا اس ادا سے زمین پر جما دیا جیسے وہ اسے کبھی نہیں اٹھائیں گے۔ میں نے دو اُنگلیوں اور انگوٹھے میں گیند لی، اس مرتبہ بریک کرتے ہیں۔ لیکن کہاں کی بریک اور کیسی بریک، میں نے ایک عجیب فضول سی گیند

پھینکی جو دھپ سے اُن کے پیڈ کو لگی۔ "ہاؤزاٹ" میں نے چیخ ماری، امپائر کی اُنگلی آسمان کی طرف اُٹھ گئی، اور لوگ دیوانے ہو گئے، ایسی ایسی فلک شگاف اور زمین دوز چیخیں سنائی دیں کہ میں غش کھاتے کھاتے بچا۔ ہیٹ ٹرک ہو گیا۔ تین گیندوں میں تین کھلاڑی آؤٹ۔ اب آخری کھلاڑی آرہا ہے، اور تین رنز باقی ہیں۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ایک پھریری لی، اس وقت کچھ نہیں سوچنا چاہیئے۔ خیر! اس مرتبہ بہ یک ضرور کراؤں گا۔ میں نے گیند کو توڑ مروڑ کر پھینکا۔ گیند ترچھی گئی ـــــ ارے! یہ کیا؟ راستے ہی میں گیند ایک طرف کو مڑ گئی، اور کھلاڑی کے برابر سے نکل گئی، وکٹ کیپر نے روک لی اور میری طرف پھینک دی۔ اور ہجوم کو جیسے سانپ سونگھ گیا، اتنا بڑا مجمع یکلخت خاموش ہو گیا، بے شمار آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں اس انداز سے جیسے کہہ رہی ہوں کچھ نہیں بھئی تم تو بالکل بیکار ثابت ہوئے، سب کیئے کرائے پر پانی پھیر دیا، لعنت ہے۔ اور میں بھی کچھ بیزار سا ہو گیا۔ مجھے اپنے اُوپر شرم آنے لگی، اب یہ اوور کی آخری گیند ہے اور آخری کھلاڑی، ب کی چمپئی اوڑھنی بار بار آنکھوں کے سامنے کوند جاتی تھی۔ اب یہ لڑکیاں کیا کہیں گی، تقریباً میدان مار ہی لیا تھا، اگر اب ہارے تو بڑا افسوس ہوگا۔ آج شام کو کلب میں کوئی نزدیک بھی نہ پھٹکے گا۔ اچھا چلو گیند پھینکو ـــــ میں جتنی تیزی سے بھاگ سکتا تھا بھاگا، اور پوری طاقت سے گیند پھینکی، اور نہ جانے کیا سمجھ کر کھلاڑی کی طرف بھاگتا ہی چلا گیا، اُس نے گھبرا کر گیند روکنے کے لئے بلا آگے کر دیا جیسے آئینہ دکھاتے ہیں، گیند بلے پر پڑی اور ذرا اُچھلی، میں نے آنکھیں میچ کر ایک قلانچ بھری، اُچھلا، گرا، اور گرتے گرتے گیند ہوا میں کیچ کر لی، اور جیسے غدر مچ گیا۔ زلزلہ آ گیا۔ بہت سی عمارتیں گر پڑیں، کسی نے سارا کوہ ہمالیہ اٹھا کر سمندر میں پھینک

دیا۔ جیسے میں نے قطب صاحب کی لاٹھ سے چھلانگ لگادی، اور راستے ہی میں بے ہوش ہوگیا۔ اُس بے ہوشی کے عالم میں فقط ایک خیال میرے دماغ میں گدگدی کر رہا تھا — ہم جیت گئے، ہم جیت گئے۔

اور جب مجھے پوری طرح ہوش آیا تو میں کلب میں تھا اور ن کے ساتھ کیرم کھیل رہا تھا، سامنے صوفے پر ب، اور ط بیٹھی تھیں اور ع، میرے بلیزر کی جیبوں سے نہ جانے کیا کیا الا بلا نکال رہی تھیں جو ہجوم نے خوشی سے پاگل ہو کر جیبوں میں ڈال دیا تھا۔ مونگ پھلیاں، کیلے، گنڈیریاں، سگریٹ کی ڈبیاں، ایک کنگھا، ایک امرود، ایک روپیہ، دو رومال اور نہ جانے کیا کیا۔

اور چاروں طرف سے میری تعریفیں ہو رہی تھیں۔

"دیکھو بھئی تم میری اس قدر تعریفیں نہ کیا کرو، مجھے سخت غلط فہمی ہو جاتی ہے اور کئی دنوں تک رہتی ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کی تعریفیں کون کرتا ہے، ہم تو آپ کے کھیل کی تعریفیں کر رہے تھے، اس میں آپ کی تو کوئی خوبی نہیں — بس —!"

"لاحول ولا قوۃ! آپ پھر جھوٹ موٹ تعریفیں کر کے مجھے غلط فہمی کرا رہی ہیں، اگر آپ ساتھ ساتھ میری بُرائیاں بھی بتا دیا کریں تو شاید مجھے احساسِ کمتری ہو جائے۔"

"احساسِ کمتری اور آپ کو؟" ب بولیں "ناممکن ہے، آپ کو جو یہ احساسِ برتری ہو گیا ہے یہ کسی طرح بھی نہیں جا سکتا، آپکی نگاہوں میں اپنے سوا اور کوئی جچتا ہی نہیں، آپ ہر وقت اپنے متعلق سوچتے رہتے ہیں، اپنے لباس کا فکر ہے، اپنے بالوں کا فکر ہے۔ کبھی آپ نے کسی اور کے متعلق بھی سوچا؟"

دع، مسکرا دیں "اور مجھے ایسے انسان پسند ہیں جو ہر وقت اپنے متعلق ہی سوچتے رہیں، جنہیں کسی کی پروا نہ ہو"

مجھے کچھ غصہ سا آگیا، عجیب ہیں یہ لڑکیاں، ابھی کچھ کہہ رہی تھیں اور اب کچھ اور شروع کر دیا ہے۔

"آخر کیوں ہو ہمیں کسی کی پروا؟" میں بولا۔ "احساس برتری کیوں نہ ہو، بھلا ہم کسی سے کم ہیں، اگر کسی کو ضرورت ہو تو آئے، تین مرتبہ سلام کرے اور ہمارا دوست بنے، ورنہ سب جائیں جہنم میں، ہماری زندگی میں اور بھی بہت سی دلچسپیاں ہیں"

"ارے، آگئے نہ اپنی اصلی باتوں پر" دع، ایک شرارت آمیز تبسم سے بولیں "دیکھ لیا نا، بس یہ چیز ہمیں پسند نہیں، ہمیں تو اعتراف ہے کہ آپ بڑے اچھے ہیں، لیکن یہ جو بچپنہ ہے یہ — !"

"ارے! یہ سفید بال رہا آپ کے سر میں" دع، نے میرے سر میں سے ایک بال کھینچتے ہوئے کہا۔ "توڑ لوں؟"

"جھوٹ!"

"ایمان سے، بالکل سفید ہے"

"توڑ لو"

"نہیں، اگر توڑ لیا تو اس کی جگہ سات سفید بال اور نکلیں گے"

"مجھے یقین نہیں آتا"

اور دع، نے بال کھینچ کر سامنے کر دیا، بالکل سفید تھا۔

"اب آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں" وہ بولیں۔

"نہیں، دراصل میں خوشبودار تیل سر میں لگاتا ہوں اس لیئے یہ بال سفید ہو گیا۔"

"جی نہیں عمر کا تقاضہ ہے۔"

"آج کیا تاریخ ہے — ؟ — تو گویا چند دنوں کے بعد میں تیئیس ۲۳ سال کا ہو جاؤں گا، اور اگر تیئیس سال سے بڑھاپا شروع ہو جاتا ہے تو اور بات ہے۔"

"اگلے ہفتے آپ کی سالگرہ ہے ؟ — آپ نے بتایا ہی نہیں۔"

"کون سی نئی بات ہے، ہر سال آتی رہتی ہے۔"

"بھئی ہم ایک پارٹی لیں گے آپ سے، کلب میں ایک عالیشان پارٹی ہو گی۔"

"پارٹی وارٹی کی بات غلط ہے، میں پہلے ہی فضول خرچ ہوں، بس آپ لوگوں کو سینما لے جاؤں گا۔"

"اُفوہ! اس قدر سخاوت — حاتم طائی کو شرمندہ کرنے کا ارادہ ہے۔"

"اچھا چلیئے، پارٹی نہیں سہی، ایک چھوٹا سا پکنک ہی سہی، اتوار کے روز — بس" "ن" بولیں۔

"لیکن بھئی میں بے حد فضول خرچ — !"

"یہ کیا فضول خرچ لگا رکھی ہے — اچھا نکالیئے اپنا بٹوہ، دیکھیں اس وقت کیا کچھ ہے آپ کے پاس — !"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا، ساری جیبیں دیکھیں — یہ بٹوہ کہاں گیا؟ کھو گیا؟ میں نے بلیزر کو اچھی طرح اُلٹ پلٹ کر دیکھا، بٹوہ نہیں ملا۔

"کھو گیا ؟"

"جی ہاں! شاید کھویا گیا، گر گیا ہوگا کہیں، آج دوپہر تو تھا۔"

"کہاں گرا دیا؟ آپ سب کچھ بھول جاتے ہیں، سب کچھ کھو دیتے ہیں، کسی کی پروا نہیں کرتے۔ آخر آپ کا ارادہ کیا ہے؟"

"بھئی اب کھویا گیا تو کھویا گیا، قصہ ختم ہوا۔" میں نے کہا۔ اور ایک سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔

"ماشاء اللہ، کیا بے نیازی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ بٹوہ خالی تھا۔"

"اچھا چلو، دیدو ان کا بٹوہ — !" رع، بولیں، اور انہوں نے بائیں طرف مڑ کر دیکھا میں نے بھی مڑ کر دیکھا، وہی حسین چہرہ دکھائی دیا جو میں نے میچ میں دیکھا تھا، یہ کون ہیں؟ اتنی دیر سے اکیلی بیٹھی ہمیں دیکھ رہی ہوں گی، شاید ان کی نگاہوں کی ہی تمازت ہے جسے میں اتنی دیر سے محسوس کر رہا ہوں۔ وہ مسکرائیں

میری طرف ہاتھ بڑھایا، ہاتھ میں بٹوہ تھا، میں نے اُٹھ کر لے لیا، اور میری اُنگلیاں اُن کی انگلیوں سے چھو گئیں۔

"شکریہ!"

"انہیں میدان میں ملا تھا، زمین پر پڑا ہوا۔" رع، بولیں۔ "ادھر لائیے میں دیکھتی ہوں اچھا — یہ تصویر کس کی ہے؟ — اچھا چلئے اسے نہیں دیکھتے —"

میں نے کنکھیوں سے بائیں طرف دیکھا، دو نشیلی آنکھیں مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں اور میرا چہرہ جلنے لگا، آخر ان نگاہوں میں کیا جادو ہے۔

ایک آواز نے مجھے چونکا دیا۔ مجھے دت صاحب بلا رہے تھے۔

میں نے معذرت کی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دت صاحب نے میرے شانے پر ہاتھ

رکھ کر کہا "شاباش بچے، آج تم نے کمال کر دیا —!"

"جی یہ آپ کی ذرّہ نوازی ہے — ورنہ —!"

"ورنہ بندہ تو بالکل نالائق ہے —!" "ع" نے آہستہ سے کہا۔

دت صاحب مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں شطرنج ہو رہی تھی، یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ کون شطرنج کھیل رہا ہے۔ بے شمار لوگ کھیلنے والوں پر جھکے ہوئے تھے مسز دت ایک طرف بیٹھی کچھ بن رہی تھیں، انہوں نے عینک اتاری، میری طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولیں — "آؤ بچے! تم ضرور بھوکے ہو گے" یہ مسز دت کا مخصوص فقرہ تھا، اس سے اگلا فقرہ ہوتا تھا — "تم کیا کھاؤ گے؟"

چنانچہ وہ فوراً بولیں — "تم کیا کھاؤ گے؟"

"میں ہوا کھاؤں گا قسم کھاؤں گا" میں نے کہا۔

"بڑا شریر لڑکا ہے" انہوں نے بزرگانہ شفقت سے کہا اور ہیڈ بیرے کو اشارہ کیا۔ اُس نے وہیں سے آواز دی "گلبدن"

ہیڈ بیرے نے دوسرے بیروں کے نام رکھے ہوئے تھے — "تپ دق" "گلبدن" "شیخ چلی" "علی بابا" "گینڈا" "اُودبلاؤ"

"آج تو ہم نا امید ہو چکے تھے" دت صاحب بولے "تعجب ہے کہ کپتان تم جیسے بولڈ کو بھول ہی گیا تھا۔

"اجی میرے شانے میں موچ آگئی تھی — آداب عرض ورما صاحب، — جی! — وہ تو اتفاق ہو گیا — ورنہ کہاں میں اور —!"

ورما صاحب ایک تندرست سا سگار منہ میں دبائے ہوئے تھے۔

"بھئی ہم تو یہی کہتے ہیں کہ کلب کی آدھی رونق صرف تمہارے دم سے ہے، تمہاری باتوں سے ہمارے اُترے ہوئے چہرے کھِل جاتے ہیں"

"آپ کی عنایت ہے ___ اور یہ شطرنج کون کون کھیل رہا ہے؟"

"مسٹر اور مسز سنگھ"

اور میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا اُس جمگھٹ میں شامل ہو گیا۔ مسٹر سنگھ کو مشورے دینے والے بہت تھے، رہ رہ کر مسز سنگھ اسی بات کی شکایت کرتی تھیں۔

"گھوڑا چلیئے ___ جناب گھوڑا!" کسی نے سنگھ صاحب سے کہا۔

"آپ گدھا چلیئے ___ میں نے مسز سنگھ سے کہا، "اگر یہ گھوڑا چلتے ہیں تو آپ گدھا چلیئے"

لوگ ہنسنے لگے۔

"خدا کے لئے اپنا فیل بچایئے سنگھ صاحب" ایک طرف سے آواز آئی۔

"فرشتوں کے لئے اپنا شتر بچایئے ___" میں نے مسز سنگھ سے کہا "ہمیں فیل کی اتنی پروا نہیں جتنی شتر کی ہے۔"

مسز سنگھ اب دلیر ہو گئی تھیں، اب اُن کا ایک حمائیتی انہیں مشورے دے رہا تھا۔

"اور مسز سنگھ اس پیادے کو آپ زیادہ نہ چلایئے، پیدل چلتے چلتے تھک جائے گا۔"

"سنگھ صاحب خدا کے لئے اپنا رُخ اس طرف لے آیئے" کوئی بولا۔

"اور آپ بھی اپنے رُخ کا رُخ بدلیئے" میں نے مسز سنگھ سے کہا

"شہہ بچیئے" سنگھ صاحب مسز سنگھ سے بولے۔

"آپ پروانہ کیجیئے مسز سنگھ" میں نے کہا "بادشاہ مرتا ہے تو مر جائے اس کے اُوپر بھی تو کوئی ہوتا ہے"

بادشاہ سے اُوپر کیا ہوتا ہے صاحب؟" کسی نے پوچھا۔

"یکہ ــــ!" میں نے جواب دیا۔

میں واپس اُسی کمرے میں آیا جہاں لڑکیاں بیٹھی تھیں، راستے میں ایک صاحب منہ میں سگار دبائے اپنی جیبیں ٹٹولتے جا رہے تھے، غالباً دیا سلائی ڈھونڈ رہے تھے میں نے جلدی سے دیا سلائی نکالی اور اُن کا سگار سلگا دیا۔

"شکریہ!" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ "بیٹھیئے ــــ!"

میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے اپنا تعارف خود کرایا، انہیں اس شہر میں آئے صرف ڈیڑھ ہفتہ گذرا تھا۔ کلب میں وہ آج پہلی مرتبہ آئے تھے، انہوں نے میچ میں مجھے کھیلتے دیکھا تھا، وہ محکمہ جنگلات کے کوئی بہت بڑے افسر تھے، بڑے ہنس مکھ اور زندہ دل معلوم ہوتے تھے۔

"اور اس سے ملئے، یہ میری لڑکی وص ہے، جس نے اسی سال بی۔ اے کیا ہے، یہ بھی پہلی مرتبہ کلب میں آئی ہے۔" میں نے اُس کی طرف دیکھا۔ ارے! یہ تو وہی نیا چہرہ ہے، آج عجیب عجیب حادثے ہو رہے ہیں آج ہی تعارف بھی ہو گیا، میں ذرا جھکا اور اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"تم یہاں بڑے ہر دلعزیز معلوم ہوتے ہو" وہ بولے "آج تم بہت اچھے کھیلے" اور دو نشیلی آنکھیں مجھے بدستور دیکھ رہی تھیں۔

"ابھی تک یہاں، مجھے دوست نہیں ملے، تم کہاں رہتے ہو؟"

میں نے پتہ بتا دیا۔

"ارے ہمارے پڑوس میں رہتے ہو۔ تمہارے اور کون کون ہیں؟"

"میں تنہا رہتا ہوں"

"تنہا رہتے ہو؟ — اچھا — یہ بات ہے، اکیلے میں ضرور جی اچاٹ ہو جاتا ہوگا، کل سہ پہر تم ہمارے ساتھ چاء پیو گے"

میں ذرا ہچکچایا، لیکن وہ نشیلی آنکھیں کچھ اس طرح مجھے دیکھنے لگیں جیسے التجا کر رہی ہوں۔

"میں ضرور آؤں گا، اور آپ کا بے حد شکریہ، اب مجھے اجازت دیجئے آداب عرض!" میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا کیونکہ 'ع' اور 'ن' پردوں میں سے جھانک رہی تھیں۔ میں واپس پہنچا ہی تھا کہ طعنے شروع ہو گئے۔

"تو گویا مس جنگلات سے آج ہی واقفیت بھی ہو گئی، چلئے یہ کسر بھی پوری ہوئی"

"آپ کے انتخاب کی داد دیتی ہوں"

"بیچاری بے حد حسین اور معصوم سی دکھائی دیتی ہیں"

"جی نہیں، یہ بات نہیں" میں نے کہا — "وہ تو اُن کے ابا سے ویسے ہی رسمی طور پر تعارف ہو گیا تھا"

"تو اس میں ہرج ہی کیا ہے، میں تو ویسے ہی کہہ رہی تھی، فقط 'ن' صاحبہ ذرا پریشان ہو رہی تھیں۔" 'ع' بولیں۔

"واقعی میں پریشان ہو رہی تھی لیکن میں نے آپ کی تصویر اپنے لاکٹ میں نہیں لگا رکھی۔" 'ن'، 'ع' کی طرف دیکھ کر بولیں۔

"اور میں آپ کے پسندیدہ رنگوں کی ساڑیاں ہرگز نہیں پہنتی، نہ مجھے اپنے بالوں کی دو چوٹیاں بنانے کا اس لئے شوق ہے کہ آپ پسند کرتے ہیں۔" 'ع' نے 'ن' پر چوٹ کی۔

"اور میں ہر وقت اپنے ابّا سے آپ کے متعلق باتیں نہیں کرتی رہتی، میں آپ کی سالگرہ کے تحفوں کے لئے بھی اتنی پریشان نہیں ہوں۔" 'ن' بولیں۔

"وہ تو خیر ہوا، لیکن میں نے سب سہیلیوں میں یہ نہیں مشہور کر رکھا کہ ......"

اب یہ ضرور لڑ پڑیں گی، یہ لڑکیاں بھی عجیب و غریب چیز ہیں، ابھی بزرگوں کی طرح نصیحتیں کر رہی ہیں اور ذرا سی دیر میں بچّوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ نوچنے کے لئے تیار ہیں۔

"وہ ورما صاحب مجھے بلا رہے ہیں۔" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ "معاف کیجئے۔" اور راستے میں مجھے سچ مچ مسز ورما مل گئیں۔

"آداب عرض! چچی جان۔"

"خبردار لڑکے جو تو نے مجھے آئندہ چچی وچی کہا ہے۔ تو کیا میں اتنی عمر رسیدہ ہوں جب بھی تو چچی جان کہتا ہے کئی دنوں تک مجھے یہی خیال رہتا ہے کہ میں بوڑھی ہوتی جا رہی ہوں۔" اور مسز ورما خدا کے فضل سے چھ بچوں کی ماں تھیں۔

"آپ، تو بگڑنے لگیں، دیکھئے نا چچی جان وہ ـــــ!"

"پھر وہی چچی جان ـــــ!" اس دفعہ وہ مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔

ہم باتیں کرنے لگے، اور انہوں نے ایک بڑی دلچسپ بات سنائی، وہ یہ کہ 'ع' اور 'ن'، وغیرہ نے مسز ورما کو رشوت دی تھی کہ وہ مجھ سے علیحدگی میں مل کر یہ دریافت کریں کہ ان میں سے کسے پسند کرتا ہوں۔ اور اس سازش کا پتہ ہرگز نہ چلنے پائے۔ مسز ورما یہی ظاہر کریں کہ وہ اپنی طرف سے پوچھ رہی ہیں۔

"تو بھئی تم ان میں سے کسے پسند کرتے ہو؟"

"کسی کو بھی نہیں۔"

جھوٹ مت بولا کرو۔"

"ایمان سے۔"

"کیوں آخر؟"

"ان میں تصنع حد سے زیادہ ہے، بات بات پر بنتی ہیں، کسی نے بال ترشوا رکھے ہیں، کوئی ہر وقت ناخنوں پر پالش کر رہی ہے، بات بات پر شکریہ، معاف کیجئے، بڑی خوشی ہوئی، اور میں ٹھہرا بے وقوف سا لڑکا، یہ لوگ مجھ سے کہیں عقلمند ہیں"

"اور یہ جو جنگلات کی خاتون آئی ہیں یہ؟"

"ان سے ابھی واقفیت نہیں ہوئی۔"

"تو پھر میں اُن لوگوں کو کیا جواب دوں؟ وہ میری جان کھا جائیں گی۔"

"کہہ دیجئے کہ ذکر ہی نہیں چھڑا۔"

"تب تو وہ اور بھی تنگ کریں گی، بھئی تم کوئی نہ کوئی جواب ضرور دو۔

"اچھا تو لیجئے جواب، یہ رہی پنسل، کسی کاغذ پر لکھتی جایئے۔ — 'ع' سے کہئے کہ۔

آپ نے مجھ کو انتخاب کیا
آپ کے انتخاب کے صدقے

اور 'ط' سے کہئے کہ —

کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر
کچھ اُمید جواب میں گذری

"تو کیا تم نے اُس سے کچھ کہا تھا؟ کوئی سوال کیا تھا؟؟"

"توبہ کیجئے چچی جان، میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔"

"پھر تو نے چچی جان کہا۔" وہ ڈانٹ کر بولیں۔

"اور 'ن'، کا میں ادب کرتا ہوں، وہ مجھ سے بڑی ہیں، اُن سے صرف یہ کہہ دیجئے کہ۔

دلِ مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غمگسار تھا نہ رہا"

"اس کا مطلب؟"

"مطلب وہ خود سمجھ جائیں گی۔"

"خاک سمجھ جائیں گی، مجھے بھی تو پتہ چلے۔"

"مطلب تو مجھے بھی نہیں معلوم۔"

"اچھا، اگر وہ ناراض ہو گئیں تو؟"

"تو ہو جائیں۔"

"توبہ توبہ، کتنا مغرور لڑکا ہے۔ تجھے کوئی پسند بھی ہے، اچھا، اُن جنگلات والی خاتون سے کیا کہوں؟"

"انہوں نے پوچھا تو نہیں۔"

"تب کیا ہوا، میں ویسے ہی کہہ دوں گی۔"

"سچ مچ؟"

"سچ مچ!"

"ایمان سے؟"

"ایمان سے!"

"تو اُن سے یہ کہہ دیجئے ۔۔۔ آپ لکھتی جائیے ۔۔۔ کہہ دیجئے کہ ۔۔۔

چھلکے تری آنکھوں سے شراب اور زیادہ
مہکیں ترے عارض کے گلاب اور زیادہ
اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ۔"

اور ہال کمرے میں پیانو بجنا شروع ہو گیا۔ غالباً حسن بجا رہے تھے۔ انہیں موسیقی سے لگاؤ تھا، تقریباً سارے ساز نہایت اچھی طرح بجاتے تھے۔ پیانو اُن کا محبوب ساز تھا۔ ہم سب ہال کمرے کی طرف لپکے، جونہ اُن کے ساتھ وائلن بجا رہے تھے۔ میں دروازے میں کھڑا سن رہا تھا، کیونکہ ساری لڑکیاں اندر پہنچ چکی تھیں اور میں اُن کے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا۔ اتنے میں بیرے نے ایک کاغذ لا کر دیا، مسز حسن باہر برآمدے میں مجھے بلا رہی تھیں۔ مسٹر اور مسز حسن کی

میں بہت زیادہ عزّت کرتا تھا، دونوں بے حد خلیق اور مہربان تھے، مجھے بچوں کی طرح چاہتے تھے، ویسے عمر میں کچھ اتنے بڑے بھی نہیں تھے۔ اُن کی شادی کو بمشکل پانچ چھ سال گذرے ہوں گے۔ اس قدر خوبصورت اور پیارا جوڑا کلب بھر میں نہیں تھا جب دیکھو مسکرا رہے ہیں ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے، مجھے اُن کی زندگی پر رشک آتا تھا۔

مسز حسن باہر کھڑی تھیں، چہرے پر پریشانی کے آثار تھے، میں نے سلام کیا۔ بولیں "کل مجھے کسی وقت مل سکتے ہو؟ —— ایک ضروری کام ہے۔"

"فرمایئے۔"

"اب نہیں، کل کوئی وقت دو، جب تمہیں بالکل فرصت ہو۔ ایک کام میں تمہاری مدد درکار ہے۔"

"میں حاضر ہوں۔ سہ پہر کے بعد مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔"

"تو پھر کل شام کے آٹھ بجے ٹینس لان میں۔" وہ بولیں۔

"آپ بے حد پریشان ہیں، خدانخواستہ کوئی بُری خبر یا کوئی حادثہ ——!"

"نہیں نہیں —— کوئی بُری خبر نہیں، ویسے ہی ایک کام ہے اور آج میرا جی بھی نہیں لگ رہا۔"

ہم دونوں ہال کمرے میں چلے آئے۔

حسن بدستور پیانو بجا رہے تھے اور جونز وائلن کم بجا رہے تھے اور جھوم زیادہ رہے تھے۔ موسیقی ختم ہوئی، تالیاں بجیں۔ اب رات کے دس بج چکے تھے اور لوگ اپنے اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ موٹروں کے ہارن بجنے کی

آوازیں آنے لگیں۔

میں حسن اور مسز حسن کے متعلق سوچ رہا تھا شادی سے پہلے ایک دوسرے کو جانتے تک نہ تھے، اور اب شادی کے بعد اُن کی محبت پر لوگ رشک کرتے ہیں، اُن کی محبت مثالی ہے، ایک دوسرے پر جان دیتے ہیں، یہ محبت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، شکر رنجی تو ایک طرف رہی آج تک ایک نا ملائم سا لفظ بھی نہیں نکلا۔ یہ دونوں کس قدر مسرور ہیں؟ حسن ایک بڑے افسر ہیں، اپنے کام میں بھی کامیاب ہیں اور زندگی میں بھی کامیاب ہیں۔ مسز حسن حسین ہیں، شائستہ اور وسیع خیالات کی خاتون ہیں۔ دونوں کے معیار نہایت بلند معلوم ہوتے ہیں کہ انہوں نے ایک دوسرے کو منتخب کیا۔ قسمت ان پر کتنی مہربان ہے۔

•

اگلے روز سہ پہر کو میں ر،س، کے ہاں گیا، وقت سے ذرا پہلے ہی چلا گیا۔ وہاں صرف ر،س، ملیں، اُن کے ابا ابھی تک دفتر سے واپس نہیں آئے تھے۔ ر،س، نے نہایت خوشنما لباس پہن رکھا تھا، رنگوں کے انتخاب میں وہ خوش مذاق معلوم ہوتی تھیں۔ ہم نے آدھ گھنٹہ انتظار کیا، پھر اُن کے ابا کا فون آ گیا کہ مصروفیت اس قدر ہے کہ شام سے پہلے نہیں آسکیں گے۔ ر،س، کی امی خدا جانے کہاں تھیں؟ میں نے قصداً اُن کے متعلق نہیں پوچھا، ممکن ہے کہ یہاں آئی ہی نہ ہوں۔

ہم نے چائے پی، اس دوران میں باتیں بہت کم ہوئیں، بس ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہے۔ ایک لمحے کے لئے دیکھا اور آنکھیں نیچی ہو گئیں کچھ دیر کنکھیوں سے

دیکھتے رہے پھر جو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا ہے تو بس نگاہیں جم کر رہ گئیں۔

رص، اپنا البم لے آئیں، جسے ہم دونوں ایک صوفے پر بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ اُن کی کئی تصویریں تو اتنی پیاری تھیں کہ جی چاہا مانگ لوں، پھر سوچا اتنی جلدی کیا ہے، شاید مانگنے کی نوبت ہی نہ آئے اور خود ہی یہ تصویریں مجھے پیش کی جائیں۔

پھر میں نے کلب چلنے کو کہا، بولیں "چلیے اکٹھے چلیں" لیکن کار اُن کے ابا لے گئے تھے، اور میری موٹر سائیکل کی سائڈ کار غائب تھی، اور موٹر سائیکل کے پیچھے میں انہیں بٹھانا نہیں چاہتا تھا، پیدل جانے میں بھی مصیبت ہی تھی کیونکہ کلب کافی دور تھا، آخر طے ہوا کہ میں انہیں موٹر سائیکل پر ہی لے چلوں، میں انہیں اپنے ہاں لے آیا، انہوں نے میرے کمرے دیکھے جہاں سب کچھ اُلٹ پلٹ پڑا ہوا تھا ایک چیز بھی قرینے سے نہیں رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اتنے میں موٹر سائیکل کو ٹھیک ٹھاک کر کے باہر نکالا اتنی دیر میں انہوں نے بہت سی چیزوں کو ترتیب دے دی، گلدانوں میں پھول سجا دیئے، کمرے کا نقشہ ہی بدل گیا، کچھ دیر ہم لگاتار ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، منہ سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

کلب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ سب باہر پلاٹ میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، سب نے دیکھ لیا۔ کہ میں رص، کو موٹر سائیکل پر لایا ہوں، لیکن اس مرتبہ میں بالکل نہیں گھبرایا، رص، کو خواتین کے پاس چھوڑ کر میں ٹینس لان کی طرف چل دیا اور جلدی سے دن، میرا راستہ کترا کر نکل گئیں۔

"سنیے"! میں نے انہیں روک لیا" یہ تو وہی ہوا کہ ——

راہ میں اُن سے ملاقات ہوئی

جس سے ڈرتے تھے وہی بات ہوئی ——"

"اب یہ شعر وغیرہ اُن جنگلات والی خاتون کو سنائیے۔ آپ اکیلے کیوں پھر رہے ہیں؟ وہ مس جنگلات کیا ہوئیں؟"

"ارے بھئی —— لاحول —— !"

"میرے ساتھ ساتھ آیئے —— !" اور میں ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گئیں، پردہ اُٹھایا اور بولیں —" زمانے بھر کے ہری چگ صاحب تشریف لارہے ہیں۔"

اور اندر جتنی لڑکیاں بیٹھی تھیں سب کھڑی ہوگئیں، 'ن'، 'ط'، 'ب'، وغیرہ سب روٹھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ بڑی مشکلوں سے انہیں منایا۔

"ویسے آپ ہری چگ ضرور ہیں۔"

"دریں چہ شک !" میں نے کہا۔

"میں ایک ریکارڈ بجا سکتی ہوں؟" 'ع'، جو گراموفون کے پاس کھڑی تھیں بولیں۔

"اگر آپ اپنا وہی پسندیدہ ریکارڈ بجانا چاہتی ہیں تو ہم ہرگز سننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں آخر —— ؟"

"بھئی کوئی تک بھی ہو اس گانے میں؟ —— تو چپکے چپکے بول مینا —— کیا بات ہوئی؟ بھلا مینا بیچاری کے بولنے سے کیا فرق پڑتا ہے، اگر ساجن کہیں جیل

وغیرہ میں گرفتار نہیں ہوئے تو وہ ویسے بھی آجائیں گے۔ یہ تو ہونے سے رہا کہ مینا کو زور سے بولتا سن کر ساجن واپس چلے جائیں۔ دراصل آپ لوگوں کی دلچسپی زری کی ساڑی، سونے کی بندیا، موتیوں کی مالا سے ہے۔ نہ آپ کو ساجن کی پروا ہے اور زمینا کی ——!"

ایک قہقہہ پڑا اور رع، کھسیانی ہو گئیں۔

"تو پھر وہ لگاؤں —— یہ کون آج آیا سویرے سویرے ——؟"

"پرسوں یہی ریکارڈ میں نے اپنے ایک انگریز دوست کو سنایا۔ اُس نے خواہش کی کہ اس کا ترجمہ انگریزی میں کروں، ترجمہ سن کر وہ بڑے مزے سے بولا —— کہ دراصل اس میں غلطی محبوب کی ہے۔ اوّل تو اس قدر صبح آنے کی کیا ضرورت تھی۔ دوسرے یہ کہ محبوب کو پہلے وقت دینا چاہیئے تھا۔ اگر واقعی اُس نے اپائنٹمنٹ نہیں کی تو اسے کوئی حق نہیں کہ کچی نیند سے کسی کو اٹھا دے اور یہ عاشق کی سخت غلطی ہے جس نے ایسا عجیب محبوب چنا ہے۔ جسے وقت کی کوئی تمیز نہیں ہے۔"

"تو پھر آپ ہی اپنی پسند کا لگایئے۔" رع، ہار کر بیٹھ گئیں۔

اور میں نے اُٹھ کر ایک انگریزی ریکارڈ لگا دیا، جس کا گانا یہ تھا —— کہ اگر میں نے دوبارہ کبھی محبت کی تو تم سے ہی محبت کروں گا۔ اگر میں نے اپنا دل دوبارہ کھویا تو وہ تمہاری ہی نذر ہو گا۔۔۔۔۔

"غلط ہے غلط ہے ——!" دن نے ریکارڈ بند کر دیا —— "یہ گانا ہری چگوں کا ہرگز نہیں ہے، آپ تو وہ گایئے —— ابھی عشق کے امتحان اور بھی ہیں ——!"

"دریں چہ شک ——!" میں نے کہا۔

اتنے میں دت صاحب کا بلاوا آ گیا، اُن کے ساتھ دوست کھیلے کچھ دیر کے بعد سب اُٹھ کر اندر چلے گئے، آٹھ بجے مسز حسن سے ملاقات ہوئی، ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے دور نکل گئے، ایک بنچ پہ بیٹھ کر باتیں شروع ہوئیں۔ چاندنی میں مسز حسن کا چہرہ ایسا زرد معلوم ہو رہا تھا جیسے خزاں کا سوکھا ہوا پتہ۔ اُن کی باتیں بے ربط تھیں اُن کے چہرے پر گھبراہٹ تھی، اور آنکھیں زمین پہ گڑی ہوئی تھیں۔ وہ بولیں۔

"یہ ایک درخواست ہے اسے میری التجا سمجھئے، کیا آپ حسن صاحب سے میرے لئے کچھ دنوں کی چھٹی لے سکتے ہیں؟"

"یعنی؟"

"یہی کہ میں پندرہ بیس دنوں کے لئے کشمیر جانا چاہتی ہوں۔"

"آپ نے حسن صاحب سے خود گفتگو نہیں کی؟ —— انہوں نے کیا جواب دیا؟"

"نہیں میں خود اُن سے نہیں پوچھ سکتی، اور نہ ہی یہ چاہتی ہوں کہ وہ بھی ساتھ جائیں، میں اکیلی جانا چاہتی ہوں۔"

"لیکن آپ کشمیر کیوں جانا چاہتی ہیں؟ —— نومبر کا مہینہ ہے سردیاں شروع ہیں۔"

"یہ میں نہیں بتا سکتی، لیکن اگر آپ کسی طرح حسن صاحب سے اجازت لے سکتے ہوں تو دریغ نہ کیجئے، کہہ دیجئے کہ صحت اچھی نہیں، کسی بیماری کا بہانہ کر دیجئے۔ اور آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے کشمیر تجویز کر دیجئے، وہ ضرور اجازت دیدیں گے۔"

"اس صورت میں وہ چھٹی لینے کی کوشش کریں گے، اور آپ کے ساتھ جائیں گے۔"

"نہیں میں تنہا جانا چاہتی ہوں، دیکھئے، اتنے بہانے ہو سکتے ہیں، یہی کہ

کشمیر میں میری کوئی سہیلی ہیں، وہاں ماتم ہوگیا ہے، انہوں نے تار بھیجا ہے یا کچھ اور کہہ سکتے۔"

"لیکن وہ کیا ہے؟ — آپ آخر کیوں وہاں جانا چاہتی ہیں؟"

"معاف کیجئے، میں وجہ نہیں بتا سکتی......" وہ کچھ دیر خاموش رہیں، میں نے آج تک اُن کو اس قدر پریشان کبھی نہیں دیکھا تھا، "ایک مہینے سے مجھے نیند نہیں آئی، بس ایک دھن لگی ہوئی ہے کسی طرح وہاں پہنچ جاؤں" — اس کے بعد جیسے انہیں اپنی گفتگو پر قابو نہ رہا، اور اُنہوں نے اپنی کہانی سنائی، ایسی کہانی کہ میں دم بخود رہ گیا، یہ مسز حسن بول رہی ہیں کیا؟ — کیا میرے کان مجھے دھوکہ تو نہیں دے رہے؟ کیا یہ سب کچھ سچ ہے؟ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہا تھا — وہ کہہ رہی تھیں:۔ "اور پہلے پہل مجھے اُس سے نفرت تھی، بے حد نفرت تھی، مجھے اُس کا سایہ زہر دکھائی دیتا تھا۔ میں نے ہمیشہ اُس کا مضحکہ اُڑایا

میں نے اُس کی توہین کی، اُس نے اپنی محبت میرے

قدموں میں رکھ دی جسے میں نے بُری طرح ٹھکرا دیا، لیکن اُس کا

ضبط کم نہ ہوا۔ میری نگاہوں میں وہ ایک خود غرض، مغرور اور بدتمیز لڑکا تھا، میرے دل میں اُس کی نفرت دن بدن بڑھتی گئی، یہاں تک کہ کئی مرتبہ میں نے اُسے سنا سنا کہ اُس کی توہین کی، اُس کی بے معنی اور خواہ مخواہ کی محبت کا مذاق اُڑایا۔ اسی طرح دن گذرتے گئے اور ایک روز حسن صاحب نے آبا کے ساتھ مجھے کہیں دیکھ لیا، ایک ڈیڑھ ہفتے کی ملاقات کے بعد انہوں نے آبا سے گفتگو کی اور وہ مان گئے، مجھ سے

پوچھا گیا۔ مجھے اُس سے اتنی نفرت تھی کہ میں نے حسن صاحب کا پیغام قبول کر لیا، جب میری شادی ہوئی تو اُس وقت مجھے کسی سے بھی محبت نہیں تھی، حسن صاحب کو میں جانتی نہ تھی۔ اب تک میری زندگی میں ایک ہی شخص آیا تھا جسے میں ہمیشہ دھتکارتی رہی۔ لیکن اپنی شادی پر مجھے مایوسی ضرور ہوئی۔ میں سمجھتی تھی کہ مجھے انتخاب کرنے کے اور بہت سے موقعے ملیں گے، میں اس سے کہیں بہتر لڑکا چن سکوں گی، کسی ہم مذاق کو۔ لیکن اس کی بجائے خود مجھے کسی نے چن لیا اور میں دیکھتی رہ گئی۔ اور آناً فاناً میں مسز حسن بن چکی تھی۔ شادی کے بعد ہم کشمیر گئے۔ وہاں بھی میرے دل میں اُس کی نفرت بدستور رہی، یہ بوجھ میرے دماغ پر بدستور رہا۔ پھر حسن صاحب مجھے اپنے ساتھ ساتھ لئے پھرے، دو سال کے بعد میں واپس گھر گئی، وہاں پہنچ کر میں نے اُس کی ناکامیوں اور بربادیوں کے قصے سُنے، اس نے اپنے آپ کو بالکل تباہ کر لیا تھا، ایک روز میں اُس کی بہن سے ملنے گئی جو میری سہیلی تھی، واپسی پر ہم اُن کی کار میں آئے۔ جسے وہ چلا رہا تھا۔ میں نے اُسے دیکھا ۔۔ اُس کی صرف پشت دیکھ سکی۔ سوکھی ہوئی گردن، سکڑے ہوئے شانے، پیلا رنگ سر کے آدھے بال سفید ہو چکے تھے رخساروں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے اس پر بیحد ترس آیا، شاید اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ ترس آیا۔۔۔ یہ اس کا کیا حال ہو گیا؟ اس مضبوط، تندرست و توانا نوجوان کی جگہ میں ایک دبلے پتلے اور بے حد غمگین انسان کو دیکھ رہی تھی جس کی ہر بات سے بڑھاپا ٹپکتا تھا۔ جب ہم گھر پہنچے تو وہ اُتر کر چپکے سے ایک طرف چلا گیا، اُسے میرا پتہ بھی تھا پھر بھی اُس نے مجھے دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور پہلے ہر وقت اُسے یہی دھن رہتی تھی کہ کسی طرح مجھے دیکھ پائے

جب میں واپس آئی تو یہ خیال جیسے میرے رونئیں رونئیں میں رچ گیا، صبح شام سوتے جاگتے، ہر وقت یہی خیال رہنے لگا، میری ساری کوشش رائگاں گئی، ہر وقت یہ الفاظ میرے کانوں میں گونجتے رہے کہ میں نے اس کی زندگی برباد کی ہے، اس کی تباہی کی میں ذمہ دار ہوں۔ میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے یہ پچھتاوا بڑھتا گیا۔ اور جب میں نے اپنے دل کو ٹٹولا تو وہاں نفرت نام کو نہ تھی۔ کیا سچ مچ اتنے دنوں سے نفرت رہی؟ — میں کہہ نہیں سکتی، اُس کا اور میرا ایک نہایت مضبوط رشتہ تھا۔ اُس نے اپنی سب سے قیمتی چیز میرے قدموں میں رکھ دی تھی، اپنا غرور، اپنی خودداری اور اپنا دل — سب کچھ، جسے میں نے ٹھکرا دیا۔ پھر بھی عرصے تک وہ سسکتی ہوئی امیدوں اور سہمے ہوئے آنسوؤں کو چھپائے اسی امید میں رہا کہ شاید میرے دل میں اُس کے لئے رحم پیدا ہو جائے۔ حتیٰ کہ میری شادی ہو گئی۔

اور اب مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ نفرت نہیں تھی شاید وہ محبت تھی، شاید وہ اُنس تھا جسے میں نفرت سمجھتی رہی۔ جب میں اُس کی برائیاں کیا کرتی تو میرا دل دھڑکنے لگتا، اس خیال سے کہ میں اُس شخص کا ذکر کر رہی ہوں جس کی قسمت کا فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے اُس کے متعلق جو کچھ میں نے لڑکیوں سے کہا وہ سب یہ ظاہر کرتا تھا کہ مجھے اُس سے دلچسپی ہے، میں اُسے برا بھلا کہتی تھی اُسے دھتکارتی تھی، اُس کی توہین کرتی تھی اس لئے کہ میں اُسے اپنا سمجھتی تھی، وہ مجھے عزیز تھا۔ لیکن یہ باتیں مجھے کئی سال کے بعد معلوم ہوئیں۔ شادی کے بعد معلوم ہوئیں۔ اور اپنی شادی سے میں بالکل مایوس ہوں۔ میرا ایک خواب بھی تو پورا نہیں ہوا۔ حسن صاحب نہایت اچھے ہیں، منس مکھ ہیں، میرا حد سے زیادہ خیال رکھتے، لیکن نہ جانے کیوں میں اس زندگی سے غیر مطمئن

ہوں یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھولی بھٹکی ادھر اُدھر پھر رہی ہوں اور راستہ نہیں ملتا۔ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود بھی حسن صاحب اور میرے درمیان ایک دیوار ہے جسے میں عبور نہیں کر سکتی۔ میں کتنی بُری ہوں، پرلے درجے کی ناشکر گذار، مجھے زندگی کی تمام نعمتیں میسّر ہیں۔ وہ مجھے کس قدر چاہتے ہیں۔ آج تک انہوں نے میری ایک بات بھی رد نہیں کی، اتنے مہربان اور حلیم رفیق بہت کم ملتے ہیں۔ خدایا میں کتنی بُری ہوں میرا گناہ ناقابلِ عفو ہے، ورانہیں یقین ہے کہ میری روح اور میری زندگی اُن کی ہو چکی ہے میرے دل میں فقط وہ ہی وہ ہیں۔ اسی لئے اُن کا برتاؤ ایسا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر جیتے ہیں پچھلے مہینے میں نے کسی سے سنا تھا کہ وہ ان دنوں کشمیر میں ہے۔ آج کل اُس کے اوقات بڑی اُداسی اور تنہائیوں میں کٹتے ہیں۔ وہ ادھر اُدھر آوارہ گردوں کی طرح پھرتا رہتا ہے۔ نہ اُس کا کوئی خیال رکھنے والا ہے نہ اُس کا کوئی دوست ہے پہلے اُس جیسا خوش پوش اور زندہ دل لڑکا شہر بھر میں نہیں تھا اور اب اُس سے بالکل اُلٹ ہے۔ سنا ہے، اب نہ اُسے لباس کی پروا ہے، نہ اپنے حلیے کی۔ پہلے اُس کے دل میں کتنی بڑی بڑی امنگیں تھیں مستقبل کے لئے بڑے بڑے ارادے تھے اور اب اُس نے پڑھائی چھوڑ کر آوارہ گردی اختیار کر لی ہے۔ بالکل سیلانی بن گیا ہے۔ آج کل اُس کا ایک بھی دوست نہیں ہے۔ گھر سے روپے منگا منگا کر کوڑیوں کی طرح لٹاتا ہے۔ اُس کے والدین پہلے تو بہت پریشان رہے۔ پھر انہوں نے بھی مایوس ہو کر اُسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا اور آجکل وہ کشمیر میں ہے۔ جن خوشنما گوشوں میں ہماری شادی کے پہلے چند ماہ گزرے۔ وہ وہیں غمزدہ اور اُداس پھر رہا ہوگا۔ مایوسیوں میں بھٹک رہا ہوگا۔ میرا دل تڑپ رہا

ہے۔کسی طرح پر لگ جائیں اور میں اُسے جاکر سنبھال لوں۔اُسے سہارا دوں۔
مجھ سے اب یہ سب کچھ سنا نہیں جاتا۔میں نے آج تک اُس سے بات نہیں کی آج
تک اُس کی محبت کا جواب نہیں دیا۔لیکن اب میں اُس سے باتیں کرنا چاہتی ہوں۔شاید وہ
میرا کہا مان لے، شاید وہ سنبھل جائے۔میں جانتی ہوں کہ اب میں کسی کی بیوی ہوں، مجھ پر کچھ
ذمہ داریاں عائد ہیں۔لیکن میرا دل بغاوت کر رہا ہے۔میں اپنی زندگی سے مایوس ہوں۔
میں اپنی زندگی سے بالکل مطمئن نہیں ہیں۔میں اُس کا خیال ہرگز اپنے دل سے نہیں نکال سکتی
اور سب سے بڑا غم جو مجھے کھائے جاتا ہے یہ ہے کہ حسن صاحب مجھے اپنی جان سے عزیز
سمجھتے ہیں۔انہیں میرا کس قدر خیال ہے۔اُن کی دنیا میں صرف میں ہی میں ہوں۔وہ میری
پرستش کرتے ہیں۔اور میں ——!" مسز حسن رونے لگیں۔

میں کچھ دیر تو یوں گم سم بیٹھا رہا۔جیسے مجھ پر بجلی آن گری ہو۔پھر میں نے
اُنہیں یقین دلایا کہ میں پوری کوشش کروں گا۔حسن صاحب ضرور مان جائیں گے۔
انہوں نے اپنے آنسو خشک کر لیے اور ہم دونوں واپس ہال کمرے میں آگئے جہاں
حسن پیانو بجا رہے تھے اور جونز وائلن۔

رص میری منتظر تھیں۔ایک کونے میں بیٹھ کر ہم کیرم کھیلنے لگے۔میں عجیب خبطی سا
بنا ہوا تھا۔جو کچھ انہوں نے کہا۔وہ میں نے بالکل نہیں سُنا۔میں نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔
وہ باتیں کر رہی تھیں، شاید اُن باتوں میں بیحد مٹھاس تھی اور اُن کی نگاہیں میرے چہرے
پر جمی ہوئی تھیں۔اُنہوں نے بار بار میری اُنگلیوں کو چھوا۔پھر شاید انہوں نے رات
کی رانی کے پھولوں کا ذکر کیا۔یا چاندنی رات کے متعلق کچھ کہا۔ہم دونوں باہر آگئے
اور پلاٹ میں بیٹھ گئے۔انہوں نے میری سالگرہ کے متعلق باتیں شروع کر دیں وہ میرے

لئے پل اوور بنا چاہتی تھیں۔ سالگرہ میں چند دن رہ گئے تھے اور اس موقعے پر وہ مجھے پل اوور تحفتہً پیش کرنا چاہتی تھیں، میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا، تب انہوں نے ناپ لینا چاہا۔ اور اپنی سفید سفید انگلیوں اور انگوٹھے سے بالشت بنا کر میرے سینے کو ناپا۔ دیر تک وہ مبہوت بنی مجھے دیکھتی رہیں۔

اگلے روز میں کلب نہیں گیا، اِدھر اُدھر پھرتا رہا، نہ کچھ کرنے کو جی چاہتا تھا نہ تنہا بیٹھنے کو، دو روز اسی طرح گذرے، تیسرے روز کلب گیا، محض حسن کو ملنے۔ اُن سے ملا، جب ہم دونوں اکیلے رہ گئے تب میں نے چھٹی کے متعلق دریافت کیا کہ کب لینے کا ارادہ ہے۔ وہ بولے ارادہ بھی ہے اور ان دنوں مل بھی سکتی ہے۔ لیکن چند مجبوریاں ہیں۔ میں نے کام کی زیادتی کا ذکر کیا۔ بولے ——" نہیں کام وغیرہ نہیں، اور ہی کچھ بات ہے، میرا تو یہ جی چاہتا ہے کہ آج چھٹی لے کر چلا جاؤں، لیکن ایک ایسی وجہ ہے کہ میں ——!"

کچھ کہنے لگے تھے کہ یکایک خاموش ہو گئے۔

"اچھا، میں سمجھا، کوئی ذاتی معاملہ ہو گا ——!"

"ذاتی ہے بھی اور نہیں بھی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کروں، ان دنوں میں اس قدر پریشان ہوں کہ بیان نہیں کر سکتا۔"

"مسز حسن کی صحت —— !" میں نے شروع کیا۔

"یہی وجہ ہے —— میں مسز حسن کو ساتھ نہیں لے جانا چاہتا، اسی لئے میں چھٹی

نہیں لیتا۔ دیکھئے نا کوئی ایسی صورت اگر ہو سکتی ہو کہ میں اکیلا کچھ دنوں کے لئے باہر جا سکوں، بیگم یہیں رہ جائیں —! کیا آپ بیگم سے کوئی بہانہ نہیں کر سکتے، مثلاً یہی کہ میری صحت گرتی جا رہی ہے اور میرے لئے آب و ہوا کی تبدیلی ازحد ضروری ہے۔"

"لیکن آپ تنہا کیوں جانا چاہتے ہیں؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتا۔ لیکن یہ سمجھ لیجئے کہ میں کہیں جانے کو تڑپ رہا ہوں، اور اگر آپ مدد کریں تو شاید یہ مشکل حل ہو جائے۔"

"لیکن آپ —!"

"ٹھہرئیے — میں سب کچھ سنائے دیتا ہوں، پہلے یہ وعدہ کیجئے کہ یہ سب کچھ سننے کے بعد آپ مجھ سے نفرت تو نہیں کریں گے، آپ میرے دوست ہی رہیں گے نا؟"

"آپ آج کیسی کیسی باتیں کہہ رہے ہیں — بھلا —!"

"مجھے یقین ہے کہ آپ میرے دوست رہیں گے —!"

اور اس کے بعد انہوں نے ایک طویل کہانی سنائی، اپنی محبت کی کہانی، اپنی واحد محبت کی، اپنی پہلی اور آخری محبت کی۔ اور جب وہ اپنی ناکامیاں بیان کرنے لگے تو اُن کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ میں بُت بنا سب کچھ سنتا رہا، میرے تخلیق کردہ نظارے دھندلے پڑ گئے۔ میرے رنگین خواب پھیکے پڑ گئے، وہ سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ میرے سامنے ایک شکست خوردہ انسان بیٹھا اپنی داستانِ غم سنا رہا تھا۔

"اور جب ہم جُدا ہوئے تو میں نے یہ سمجھا تھا کہ اب میں زندہ نہ رہ سکوں گا لیکن یہ دنیا کچھ ایسی جگہ ہے اور زندگی ایسی عجیب چیز ہے کہ رنج و غم، مصیبتیں، ناکامیاں

خواہ کچھ ہی ہو، زندہ رہنے کی خواہش کبھی نہیں مرتی، خواہ مفلوج ہو کر گھسٹتے رہیں، آنکھوں کا نور چھن جائے، اندھے ہو کہ راستہ ٹٹولنا پڑے، کچھ بھی ہو جائے، بس یہی جی چاہتا ہے کہ زندہ رہیں، جیتے چلے جائیں۔ اب مجھے دیکھ لیجئے، میں اب تک زندہ ہوں، ہر وقت مسرور رہتا ہوں، نہایت اعلیٰ عہدے پر تعینات ہوں، میں نے شادی بھی کی ہے بیگم مجھ پر اپنی جان نثار کرتی ہیں، زندگی کی ساری مسرتیں مجھے مل چکی ہیں، فقط ایک گھاؤ ہے جو کبھی مندمل نہیں ہوتا جب اُس کا خیال آتا ہے تو چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دیتا ہے، اُس کے شوہر بہت اچھے انسان ہیں، اُسے بھی سب کچھ میسر ہے لیکن اِدھر میں زندگی سے مطمئن نہیں ہوں، اُدھر اس کی زندگی بھی بے چین سی ہے۔ ان باتوں کو مدت گذر چکی، میں اب بھی محبت کا بھوکا ہوں، مجھے محبت کبھی نہیں ملی، میں نے شادی فقط اسی لئے کی تھی۔ لیکن میں اپنی شادی سے بالکل مایوس ہوں۔ مجھے کچھ بھی تو نہیں ملا جب کبھی یہ تنہائی، محبت کی یہ پیاس، روح کی یہ تڑپ بہت بڑھ جاتی ہے تو میں کسی نہ کسی طرح موقعہ پا کر اُسے ضرور دیکھ آتا ہوں، اُس سے چند باتیں کر لینے یا فقط ایک نظر دیکھ لینے سے بڑی تسکین ملتی ہے، پچھلے سال میں نے اُس سے آدھ گھنٹے تک باتیں کیں، اور مجھے اب تک خمار ہے اب مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ اپنے ابّا کے پاس آئی ہوئی ہے، جب سے میں نے یہ سنا ہے۔ میرا دل مچل رہا ہے۔ اگر بیگم مجھے کسی طرح اجازت دیدیں تو میں آج چلا جاؤں اُدھر یہ خیال مجھے ہر وقت چبھتا رہتا ہے کہ بیگم مجھے بیحد چاہتی ہیں، اُن کی زندگی میں صرف میں ہی ہوں، میری ذرا سی تکلیف پر وہ بے چین ہو جاتی ہیں، انہیں مجھ سے لا انتہا محبت ہے۔ لیکن میرے لئے وہ اجنبی ہیں۔ میں انہیں بالکل سرسری طور پر

جانتا ہوں، نہ کبھی میں نے اس سے زیادہ جاننے کی کوشش کی۔ اور اب میں کچھ بوڑھا ہوتا جا رہا ہوں۔ ویسے دیکھنے میں بالکل جوان ہوں، تندرست ہوں، شاید یہ بڑھاپا میرے جسم کا نہیں بلکہ میری روح کا ہے، میں اسے اپنی ہڈیوں میں محسوس کرتا ہوں اور وہ دن دور نہیں جب میرے دل اور میرے دماغ کی تپش ٹھنڈی ہو کر یخ ہو جائے گی، تب شاید میں اس عذاب کو بھول جاؤں گا۔ اور یہ تبدیلیاں ہم میں بالکل خاموشی سے آتی رہتی ہیں۔ آپ جتنے عمر رسیدہ اور جھریوں والے چہروں کو دیکھتے ہیں کیا آپ کو کبھی یہ خیال بھی ہوا کہ یہ دمکتے ہوئے حسین چہرے تھے۔ جن میں بلا کی کشش تھی۔ آپ نے مسز دت کو دیکھا ہے، یہاں خواتین میں وہ غالباً سب سے زیادہ عمر رسیدہ ہیں میں نے انہیں بچپن میں دیکھا تھا، آپ شاید یقین نہ کریں کہ یہی بے رونق اور زرد چہرہ کبھی اس قدر حسین تھا کہ اس سے نگاہیں نہ ہٹتی تھیں، اور یہ تبدیلیاں چپ چاپ آتی رہتی ہیں، دل میں کیسی ہی آگ جلتی رہے، خیالات میں کیسا ہی تلاطم بپا ہو، ماحول کیسا ہی ہو، لیکن قدرت ہر لمحے کے بعد پہلے سے بوڑھا بنا دیتی ہے، میرے چہرے پر وہ ترو تازگی نہیں رہی جو پہلے تھی اور اب کچھ عرصے کے بعد کچھ بھی باقی نہیں رہے گا۔ لیکن مجھے یہ شکایت ہمیشہ رہے گی کہ یہ چہرہ ہمیشہ بے قرار رہا ہے، یہ آنکھیں ہمیشہ منتظر رہی ہیں۔ اور انسان کی یہی زندگی ہے۔ بچپن میں ہمیں طرح طرح کے دھوکے ہوتے ہیں، انہی چیزوں کو ہم کسی اور زاویئے سے دیکھتے ہیں، چوک میں کھڑے ہوئے سپاہی کو دیکھ کر ہمیں اُس پر رشک آتا ہے کہ یہ شخص تفریحاً کھڑا ہے، محض اپنی شان جتانے کے لئے۔ ریل کے گارڈ کو ہم بیحد خوش نصیب تصور کرتے ہیں، جو ہر وقت ریل میں سفر کرتا رہتا ہے، پھر آہستہ آہستہ یہ خاکے دھندلے پڑ جاتے ہیں۔

حقیقتوں کا انکشاف ہوتا ہے، زندگی کی تلخیاں منہ کھولے سامنے آجاتی ہیں، تب انسان وہ تنہائی محسوس کرتا ہے جو ہمیشہ اُسے گھیرے رہتی ہے، وہ خوفناک تنہائی جس کے جنگل سے نجات مشکل ہے، وہ جس طرح تنہا خواب دیکھتا ہے۔ اُسی طرح تنہا زندہ رہتا ہے۔ اور اتنے میں اُس کے چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔ کمر دوہری ہو جاتی ہے اور وہ زندگی زندگی پکارتا ہوا یہاں سے رخصت ہو جاتا ہے۔
اس مختصر سے قیام میں وہ دوستوں کی تلاش میں ہر گھڑی سرگرداں رہتا ہے، اپنے رفیق کی تلاش میں۔ اوّل تو کوئی ملتا نہیں اور جب اتفاق سے کوئی ملتا ہے تو قدرت اُسے کہیں دور پھینک دیتی ہے اور یہ قدرت کا تحفہ ــــ یہ ابدی تنہائی ہمیشہ انسان کو گھیرے رہتی ہے۔

میں اپنی شادی سے بالکل مایوس ہوں، میری نگاہوں میں بیگم ایک اجنبی ہیں۔ ہم دونوں ایک سرائے میں ــــ ٹھہرے ہوئے ہیں، ہم دونوں کی راہیں مختلف ہیں اور یہ کتنا ظلم ہے کہ وہ مجھے اس قدر عزیز سمجھتی ہیں، وہ مجھے دیکھ دیکھ کر زندہ ہیں"... وہ دیر تک باتیں کرتے رہے، حتیٰ کہ اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اُنکی آواز بھر آگئی اور اُن کا سر اُن کے سینے پر جھک گیا۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہر ایک انسان کی کتنی کتنی زندگیاں ہیں، ایک جسے ہم دیکھتے ہیں، ایک جو کوئی اور دیکھتا ہے، ایک وہ جو وہ خود بسر کرتا ہے، پھر ایک وہ جو اُس کے خیالات اور اُس کے خوابوں میں بسی ہوئی ہے، جس کے لئے وہ کوشاں رہتا ہے ــــ اسی طرح نہ جانے کتنی زندگیاں ہوتی ہیں۔

صبح کو حسن مجھ سے ملنے آئے، اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے پوچھا۔ "اب تک آپ نے بیگم سے آنے جانے کے متعلق تو کچھ نہیں کہا؟"

"نہیں! بات یہ تھی کہ —— وہ ——!" میں معذرت کرنے لگا۔

"اب آپ قطعاً ذکر نہ کیجئے، کیونکہ آج مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ اپنے ابا کے ہاں آئی ضرور تھی لیکن اُس کا شوہر پرسوں اُسے واپس لے گیا ہے، پہلی خبر مجھے بہت دیر میں ملی، اب میرا جانا بے سود ہے۔ اب مجھے چھٹی لینے کی کوئی خواہش نہیں رہی۔"

"بہت اچھا ——!"

کچھ دیر باتیں کر کے وہ چلے گئے، اگلے روز میں کلب گیا، واپسی میں مسز حسن ملیں، وہ بدستور اُداس تھیں، انہوں نے دبی زبان سے پوچھا۔ "آپ نے حسن صاحب سے میرے لئے اجازت تو نہیں لی ——؟"

"جی نہیں! اب تک کوئی موقع نہیں مل سکا ——!"

"اب اُن سے اس کا ذکر بالکل نہ کیجئے، اب میں کہیں نہیں جانا چاہتی، مجھے کسی نے لکھا ہے کہ اب وہ کشمیر سے واپس چلا گیا ہے، اب وہ وہاں نہیں ہے، اور کسی کو اُس کا پتہ معلوم نہیں ہے۔ خدا جانے وہ اب کہاں ہے۔"

اگلے روز میری سالگرہ تھی، دوپہر کو جب میں واپس آرہا تھا تو مجھے حسن صاحب اپنی کار میں جاتے ہوئے مل گئے، وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے، اُن کے ہاں اُن کے کوئی عزیز آئے ہوئے تھے۔ مسز حسن نے مسکراتے ہوئے ہمارا استقبال کیا۔ میرا تعارف کرایا گیا۔ باتیں ہو رہی تھیں، اتنے میں حسن صاحب نے اپنی جیب سے

ایک سنہرا ہار نکالا، یہ حسن صاحب کا تحفہ تھا مسز حسن کے لئے، جسے انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے پہنایا۔ مسز حسن اندر گئیں اور ایک خوبصورت سی گھڑی ساتھ لائیں "آپ ہر ہفتے ایک گھڑی کھو دیتے ہیں، یہ میں آپ کے لئے لائی تھی"۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے گھڑی حسن صاحب کی کلائی پر باندھ دی۔ دونوں ہنسنے لگے۔ اور میں ان تحفوں کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا، یہ کیسے تحفے ہیں؟ شوہر اور بیوی آج ایک دوسرے کو تحفے کیوں پیش کر رہے ہیں؟ آج ایسی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ کیا واقعی یہ تحفے دونوں نے ایک دوسرے کے لئے چنے تھے یا اوروں کے لئے جنہیں مجبوراً پیش نہ

کئے جا سکے۔ میں اُن کے عزیز سے باتیں کرتا کرتا باہر باغ میں آ گیا۔ وہاں سے میں نے دیکھا کہ وہ دونوں ایک صوفے پر بیٹھے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے، غالباً تحفوں کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی۔ اُسی شام کو کلب میں پارٹی ہوئی، میری سالگرہ پر لوگوں نے مسرت کا اظہار کیا، مجھے چاروں طرف سے مبارکباد ملی، تحفے ملے، سب سے زیادہ حسین تحفے لڑکیوں کے تھے۔ 'ص' میرے لئے پل اوور لائی تھیں جسے انہوں نے اتنے مختصر وقفے میں بُن لیا تھا، میرے سامنے تحفوں کا ڈھیر لگ گیا، لیکن میری نگاہیں بار بار حسن صاحب کی کلائی پر پڑتی تھیں اور مسز حسن کی گردن پر، —— میں وہ دونوں تحفے دیکھ رہا تھا جو انہوں نے ایک دوسرے کو دیئے تھے۔ 'ص' نے میری جیب میں انگوٹھی ڈال دی —————— اور

شرما کر نگاہیں نیچی کر لیں اور ان کے گال سُرخ ہو گئے۔
اُنھوں نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی، رات کے دس بجے ریڈیو پر کوئی ڈراما تھا یا تقریر، مجھے دس بجے بلایا، یہ بھی کہا کہ اُن کا کمرہ میری کوٹھی سے بالکل ملحق ہے، کمرے کا دروازہ میرے باغ کی طرف کھلتا ہے، اگر میں چاہوں تو بجائے بڑے پھاٹک کے اُس چور دروازے سے بھی اندر جا سکتا ہوں، اور اُن کے کمرے میں رات کو سبز روشنی ہوتی ہے، وہ دریچے میں بیٹھ کر میرا انتظار کریں گی، اور ابا آج دورے پر گئے ہوئے ہیں۔
جب سب لوگ اپنے اپنے تحفے اور مبارکباد پیش کر چکے تو میں نے سب کا شکریہ ادا کیا، حسن پیانو بجانے لگے اور جونز نے اپنا وائلن سنبھالا اور جھومنے لگے، سب کے سب ہال کمرے میں بیٹھے تھے، اُس مجمع میں بہت سی حسین نگاہیں مجھ پر جم گئیں، مجھے نگاہوں کے ذریعے کئی پیغام بھیجے گئے، نگاہوں نے مجھ سے شکوے کئے، نگاہوں نے میرے سامنے اپنی ہار مان لی، نگاہیں مجھ سے التفات کی طالب تھیں، میرے جواب کی منتظر تھیں، لیکن میں نہ جانے کن خیالات میں کھویا ہوا تھا، میری نگاہیں کچھ سہمی ہوئی تھیں۔ حسن کی انگلیاں پیانو پر بڑی پھرتی سے چل رہی تھیں، وہ گھڑی صاف نظر آ رہی تھی، جب مسز حسن اپنا دوپٹہ ٹھیک کرتیں تو وہ جگمگ کرتا ہوا ہار آنکھوں کے سامنے کوند جاتا۔
میں نے کئی جوڑوں کو دیکھا جو ایک دوسرے کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہے تھے، کبھی کبھی مسٹر اور مسز حسن بھی آپس میں اشارے کرتے تھے۔
دیر تک یہ محفل گرم رہی۔

رات کے دس بجے میں گھر پہنچا، نہایت دلکش چاندنی چھٹکی ہوئی تھی، اتنی تیز کہ دن کا گمان ہوتا تھا، درختوں کے اُوپر ایک کمرے میں سبز روشنی ہو رہی تھی اور دریچے سے ایک پیارا چہرہ جھانک رہا تھا جس کی لٹیں ہوا کے جھونکوں سے لہرا رہی تھیں 'ص' میرا انتظار کر رہی تھیں۔ اور میں تھکا ہوا تھا، زندگی سے، اپنے خیالات سے، دنیا سے، ہر چیز سے تھکا ہوا تھا۔ آج میرا جی چاہتا تھا کہ کسی کی گود میں سر رکھ دوں اور کوئی مجھے اتنا پیار کرے کہ میں سب کچھ بھول جاؤں، مجھ پر غنودگی طاری ہو جائے اور سو جاؤں۔

میں نے غور سے 'ص' کو دیکھا، اُن کی نشیلی آنکھوں اور اُن لہراتی ہوئی لٹوں کو دیکھا اُس حسین چہرے پر بے قراری تھی، اُن کی آنکھوں میں انتظار تھا۔ پھر جیسے ایک تاریک سا خیال میرے دل پر چھا گیا — کیا یہ پہلی مرتبہ انتظار کر رہی ہیں؟ کیا میں پہلا لڑکا ہوں جسے انہوں نے پسند کیا ہے؟ اور یہ انگوٹھی؟ — کیا یہ اُن کا پہلا تحفہ ہے؟ یا یہی کھیل کئی مرتبہ دوہرایا جا چکا ہے' ان آنکھوں کی گہرائیوں کا کسے علم ہے۔ ان آنکھوں میں کون کون سما چکا ہے؟ یہ چہرہ کس کس کے لئے بے قرار رہ چکا ہے؟ — یہ کون جانتا ہے؟

تب ایک عجیب سی اداسی میرے دل میں اُترتی گئی، میری آنکھوں کے سامنے تاریکی بڑھتی گئی اور وہ دلفریب چاندنی رات مجھے تاریک اور بھیانک دکھائی دینے لگی — اور میں اندر کمرے میں چلا گیا۔ میری نگاہوں میں وہ تحفے بسے ہوئے تھے جو مسٹر اور مسز حسن نے ایک دوسرے کو پیش کئے تھے۔

خدایا! یہ خونی کھیل میں نے کیوں دیکھ لیا؟ — میں اپنے خوابوں سے اتنی جلدی

بیدار نہیں ہونا چاہتا تھا، میں ابھی یہ سب کچھ نہیں دیکھنا چاہتا تھا — میں آج کس قدر اُداس ہوں۔

میں نے وہ انگوٹھی اتار کر ایک طرف رکھ دی جو کسی کا تحفہ تھی۔

— تب میں نے اُس ابدی تنہائی کو پہلی مرتبہ محسوس کیا جو انسان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے، جو عمر بھر سائے کی طرح ساتھ رہتی ہے، جس کا تعلق ہمارے ماحول سے نہیں بلکہ ہماری روح سے ہے۔

وہ اُداسی گہری ہوتی گئی حتےٰ کہ میرا دم گھٹنے لگا، آنسوؤں کا ایک سیلاب میری پلکوں تک آ کر رُک گیا۔

یہ میں نے کیوں دیکھ لیا؟ اے میرے معبود تو نے یہ خونی کھیل دکھانے کے لئے مجھے کیوں منتخب کیا؟ کاش! میں کچھ نہ دیکھتا، کاش میں اپنی آنکھیں بند کر لیتا، اپنا دل پتھر کا بنا لیتا۔

درد کے احساس سے میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا — آج میں کس قدر اداس ہوں کس قدر غمگین ہوں۔ کاش میں یہ سب کچھ نہ دیکھتا۔

وہ تحفے جیسے میری ہتھیلیوں میں سما کر رہ گئے تھے۔

رقابت

میں ڈرتا ڈرتا ہال کمرے میں داخل ہوا۔ میرا خیال تھا کہ نظر بچا کر لائبریری میں چلا جاؤں گا، لیکن جیسے وہ لوگ میرے منتظر ہی تھے۔ جھپٹے اور مجھے دبوچ لیا، بولے چلو بلیرڈ کھیلتے ہیں، مجھے بلیرڈ سے سخت نفرت ہے۔ کھیل میں یا تو پوری طرح ورزش ہو یا پھر بالکل چپ چاپ بیٹھ کر کھیلا جائے جیسے شطرنج ہے (ویسے شطرنج بھی مجھے پسند نہیں ہے) لیکن اس بلیرڈ میں نہ تو ورزش ہی ہوتی ہے اور نہ آرام سے ہی بیٹھ سکتے ہیں۔

میں ضدی بن کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب سب تنگ آ گئے تو ذرق، بولے۔ چلو تاش کھیلتے ہیں۔ چنانچہ ہم تاش کھیلنے لگے۔ دفعتاً ایک صاحب بولے کہ اپنے ملک میں شادی کرنا بالکل ایسا ہے۔ جیسے بغیر پتے دیکھے کوئی سیون ٹو ٹرمپس کہہ دے، اس پر ایک قہقہہ پڑا، اور اب شادی پہ گفتگو ہونے لگی۔ کچھ دیر میں ہم اکتا گئے اور انگیٹھی

کے پاس جا بیٹھے۔ موضوع جھٹ بدل گیا اور دوستی پر باتیں چھڑ گئیں۔ ذوقی بولے ــــ "میرا یہ خیال ہے کہ جو ایک مرتبہ دوست بن جائے وہ ہمیشہ دوست رہتا ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جو دوست نہیں رہا۔ وہ کبھی دوست تھا ہی نہیں"۔

اس پر مختلف رائیں دی گئیں۔ دوستی سے موضوع دشمنی کی طرف چلا گیا۔ سب لوگ دشمنی کو اہمیت دے رہے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے بحث ہو رہی تھی۔

"ق" اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولے ــــ "اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اسم اعظم کیا ہے تو میں فوراً کہدوں کہ وہ ہے معافی مانگنے والے کا ایک فقرہ ــــ "مجھے معاف کر دیجئے" ــــ خواہ کتنی زبردست دشمنی ہو۔ ایک دوسرے کے خون کی پیاس ہو۔ اگر ان میں سے کوئی کیسے ہی اُوپرے دل سے یہ فقرہ کہدے تو بھی سب دُھل جاتا ہے۔ برسوں کا کینہ صاف ہو جاتا ہے"!

"لیکن ــــ!" ذوقی بولے ــــ "وہ دشمنی ہی کیا جو معافی سے جاتی رہے جس شخص کی زندگی اپنے اصول کی پابند ہو وہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔ دشمنی تو ایک نہایت ہی گہرا جذبہ ہے۔ جو لوگ زندگی کو سنجیدگی سے نہیں دیکھتے وہ مکمل انسان نہیں ہیں، کم از کم میں تو زندگی اور اس کے اصولوں کو بہت اہمیت دیتا ہوں، ذرا ذرا سی باتوں سے بڑی بڑی تبدیلیاں آسکتی ہیں، ــــ!"

"بھئی معاف کرنا!" "ق" بولے "جب کوئی سنجیدگی سے انسانی زندگی کے متعلق گفتگو کرتا ہے تو مجھے ہنسی آجاتی ہے۔ اپنا اپنا نظریہ ہے۔ لیکن یہ تو بتایئے کہ انسان میں یا اُس کی زندگی میں کوئی ایسی چیز بھی ہے جو نایاب ہو یا دیرپا ہو۔ آخر ہم کس بات پر اتراتے ہیں؟ جن دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا۔ میرا ایک دوست

میڈیکل کالج میں تھا۔ میں اکثر اُس سے ملنے جایا کرتا۔ ایک روز وہ لاش کو چیر رہا تھا۔ پہلی مرتبہ میں نے انسانی لاش کو دیکھا۔ اور شاید اُس روز پہلی مرتبہ مجھے اپنے حقیرپن اور اپنی بے مائیگی کا احساس ہوا۔ مجھے اُس لاش پر ذرا ترس نہیں آیا، مجھے اُس لاش سے اس قدر نفرت ہوئی کہ میں وہاں ایک منٹ نہیں ٹھہرا۔ اور اُس کے ساتھ ہی مجھے انسان سے بھی نفرت ہوگئی، جس کا انجام لاش بننا ہے۔"

"لیکن وہ تو لاش تھی ــــ!"

"واقعی میں نے ایک لاش دیکھی تھی۔ لیکن اس کے بعد میں نے زندہ لاشیں دیکھیں۔ گھسٹتے ہوئے اپاہج جسم، ایسے جسم جن کو بیماریوں کی دیمک نے کھوکھلا کردیا تھا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ ہسپتال میں جایا کرتا تھا۔ جہاں لوگ دن رات کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے رہتے تھے۔ مجھے اُن کے مرنے پر کبھی حیرانی نہیں ہوئی مجھے تعجب ہوتا تھا تو اس پر کہ لوگ گھن لگے ہوئے اور ٹوٹے پھوٹے جسموں کو لیکر زندہ کیونکر رہتے ہیں۔ یہاں ایک بوڑھا شخص پڑا کراہ رہا ہے۔ جس کا دل عمر بھر کی محنت و مشقت کے بعد تھک چکا ہے۔ لیکن یہ شخص اب تک زندہ ہے۔ لاعلاج ہے پھر بھی اُسے جینے کی تمنا ہے، اپنی زندگی کی بہار اور خزاں دونوں دیکھ چکا ہے زندگی سے پوری قیمت وصول کرچکا ہے۔ پھر بھی اُسے زندہ رہنے کی ہوس ہے یہاں ایک نوجوان بے ہوش پڑا ہے۔ جسے ایک حادثے نے ہمیشہ کیلئے مفلوج کردیا ہے۔ مگر یہ زندہ رہنا چاہتا ہے . . . . ادھر ایک ننھا سا بچہ سانس لینے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ اُس کے گلے میں ایک جھلی بن گئی ہے۔ جو ہوا کو اندر نہیں آنے دیتی لیکن سب سے عجیب بیماری تپ دق ہے۔ یہ مرض جہاں سینے کو چپکے چپکے چھلنی کرتا رہتا ہے

وہاں مریض کے دل میں دنیا بھر کی تمنائیں اور امنگیں بھر دیتا ہے۔ مریضوں کے سرہانے اُن کے ایکس رے رکھے ہیں، اُنہیں علم ہے کہ آج مرض کہاں تک پہنچ چکا ہے، سینے کے کون کون سے حصّے بے کار ہو چکے ہیں۔ زندگی کے کتنے دن اور باقی ہیں پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوتے، نہ جانے زندگی کی آرزو اُن کے دلوں میں اتنی تیزی سے کیونکر بھڑک اُٹھتی ہے۔ شاید کوئی معجزہ انہیں بچالے۔ شاید یہ ایکس رے غلط ہوں۔ شاید یوں ہو جائے، شاید ووں ہو جائے۔ یہ شاید انہیں ہمیشہ گھیرے رہتی ہے۔ اسی شاید کے سائے میں وہ پناہ لیتے ہیں۔ مرتے دم تک یہ غیر ممکن امیدیں اور شاید پیچھا نہیں چھوڑتے، اُن میں سے یہ تو کسی کو یقین ہی نہیں ہوتا۔ کہ کبھی موت آئے گی۔ دوسروں کو مرتے دیکھ کر بھی یہ یقین نہیں آتا ـــــ!"

"بھئی آج تم بالکل قنوطی بنے ہوئے ہو۔" ذوقی بولے "آخر تم تصویر کا محض تاریک رُخ ہی ہر وقت کیوں دیکھتے ہو، جہاں تم سوکھے ہوئے زرد چہروں کو دیکھ کر متاثر ہوتے ہو وہاں دمکتے ہوئے حسین چہروں کو کیوں نظر انداز کرتے ہو؟"

"میں نے حسین چہروں کو بھی بستر مرگ پر دیکھا ہے، دق زیادہ تر حسین چہروں کو پسند کرتا ہے۔ ایک اور بات مجھے اُلجھن میں ڈال دیتی ہے۔ میں خدا کو مانتا ہوں۔ نیکی بدی، جھوٹ سچ، گناہ اور سزا ـــ ان سب میں میرا عقیدہ ہے۔ جب کسی گناہ گار یا جھوٹے کو سزا ملتی ہے تو میں بہت خوش ہوتا ہوں، لیکن کتنی ہی مرتبہ میں نے ننھے منے بچوں کو درد سے کلبلاتے دیکھا ہے، ایسے معصوم بچے جنہوں نے ذرا سا گناہ بھی تو نہیں کیا۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ قدرت معصوم بچوں کو کیوں تڑپاتی ہے۔ ایسے ایسے عذاب دے کر مارتی ہے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ قدرت انہیں کیوں سزا دیتی

ہے؟ بے گناہ کو سزا دینا انوکھی منطق ہے۔ اس پر یہ تاکید ہے کہ جو کچھ دیکھ رہے ہو، چپ چاپ دیکھتے رہو۔ خبردار جو ایک لفظ منہ میں سے نکالا ہے تو یہی سمجھتے رہو کہ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہے۔ قدرت کی ایک ایک ادا سہانی ہے، لاجواب ہے، برمحل ہے۔ ہمارے خیالات بالکل غلط ہیں۔ دراصل قصور ہمارے دماغ کا ہے۔ اچھا اسے بھی چھوڑو، یہ بتاؤ کہ وبائیں کیوں آتی ہیں۔ شاید اس لیے کہ دنیا کی آبادی بڑھ جاتی ہے۔ اور توازن قائم رکھنے کے لئے انسان مرتے ہیں۔

یا شاید وبائیں صرف گناہگاروں کی جان لینے آتی ہے۔ لیکن اُس وقت کوئی کسی سے یہ نہیں پوچھتا کہ تم نیک ہو یا بد؟ اس طرف سے اُس طرف تک بالکل صفایا ہو جاتا ہے۔ عورتیں، بچے، مرد، نیک، بد، سب مکھیوں کی طرح مر جاتے ہیں۔ کسی جگہ رونق ہے۔ سب لوگ مسرور ہیں۔ ایک خاص وقت خدا کی عبادت ہو رہی ہے، لوگ خدا کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہیں۔ دفعتاً ایک مہیب زلزلہ آتا ہے۔ اور سب کچھ زیر و زبر ہو جاتا ہے۔ مؤدبانہ جھکے ہوئے سر وہیں کچل دیئے جاتے ہیں۔ اُس وقت یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی وحشی طاقت انسان سے انتقام لے رہی ہے۔ تب قدرت ہماری ذرا پروا نہیں کرتی۔ تب گناہ اور نیکی میں کوئی تمیز نہیں رہتی۔ آخر ہم اس قدر بے دست و پا کیوں ہیں؟ ہم اتنے لاچار و مجبور کس لئے ہیں؟ میں چاہتا ہوں کہ خدا سے یہ سوال پوچھوں کہ تو نے ہم پر اپنی اعلیٰ ترین صناعی صرف کر کے ہمیں اشرف المخلوقات بنا کر ہمارا مذاق کیوں اُڑایا ہے، ہمیں قوتِ احساس بخش کر تو ہمارے احساسات سے کیوں کھیلتا ہے۔ تو ہماری نحیف و نزار جانوں کو اتنا حقیر کیوں سمجھتا ہے؟"

"کیا کفر بک رہے ہو!" دت صاحب بولے۔ دت صاحب دراصل بزرگ پارٹی کے ممبر تھے۔ وہ کہیں پاس ہی صوفے پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

"دیکھیے نا ــــ!" دت، بولے ــــ "اب مثلاً آپ خدا سے محبت کرتے ہیں فرض کیا خدا بھی آپ سے محبت کرتا ہے۔ اور میرے دل پر کسی روز ایک عجیب سی وحشت سوار ہو جاتی ہے اور میں پستول لے کر ایک گولی آپ کے سینے کے پار کر دیتا ہوں اور آپ وہیں مر جاتے ہیں۔ اُس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔ آپ کی روح اور آپ کے خیالات کا کوئی قصور نہیں۔ قصور ہے تو میرے شیطانی خیال کا۔ اور عمر بھر کی نیکیاں اُس وقت آپ کو بچا نہیں سکتیں۔ اگر میں مارنے پر تل گیا ہوں تو آپ کو بڑی آسانی سے مار سکتا ہوں۔ اسی طرح کوئی مجھے مار سکتا ہے آپ کسی اور کو مار سکتے ہیں۔ چاقو سے شہ رگ کاٹ دیجیے۔ بس، یہ دھڑکتی ہوئی شور مچاتی ہوئی زندگی دم بھر میں ختم ہو جاتی ہے۔ آخر ہم اس قدر بے بس کیوں ہیں؟ یہاں تک کہ ہماری زندگی دوسروں کے رحم پر موقوف ہے۔ جب چاہے کوئی راہ چلتے چلتے یہ عطیہ ہم سے چھین سکتا ہے۔ جب کبھی میں کھڑا ہو کر نیچے بازار میں انسانوں کا ہجوم دیکھتا ہوں تو عجیب عجیب خیالات میرے دل میں آنے لگتے ہیں!"

"بات تھی کیا اور بن کیا گئی ــــ" دت صاحب مڑ کر بولے "ارے بھئی ذکر تو دشمنی کا ہو رہا تھا!"

"اوہ! دشمنی پر گفتگو ہو رہی تھی۔ اچھا تم بتاؤ تمہارے کیا خیالات ہیں؟"

"میرے خیالات بالکل عارضی ہوتے ہیں۔ اس لئے میں کوئی رائے نہیں دے

سکتا، اس وقت آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں میں مان لوں گا۔ کل کوئی صاحب آپ کی گفتگو پر نکتہ چینی کریں گے تو میں اُن کا بھی یقین کر لوں گا ـــــ آج تک کسی چیز کے متعلق میری رائے مستقل نہیں رہی۔"

سب ہنس پڑے۔

'ق' بولے ـــــ "میں دشمنی کو بھی وقعت نہیں دیتا۔ یہ بالکل عارضی ہے لیکن ایک اور جذبہ ہے جو دیرپا ہے ـــــ رقابت کا جذبہ۔ یہ آگ کبھی نہیں بجھتی۔ رقابت بڑی دیر تک قائم رہتی ہے۔ دشمنی کی کوئی اور وجہ ہو تو بیسیوں باتیں اُسے دھو ڈالتی ہیں۔ معافی کے چند الفاظ ایک آدھ احسان، یا پھر وقت! ـــــ وقت گہرے سے گہرے گھاؤ کو مندمل کر دیتا ہے۔ لیکن رقیبوں کو کوئی کوشش آپس میں نہیں ملا سکتی۔"

"ایک طرف تو آپ زندگی کو اس قدر معمولی شے قرار دیتے رہے ہیں۔ اور اس پر آپ ایک ادنےٰ جذبے کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔" امجد بولے۔ "میں رقابت کو نہیں مانتا۔ اگر آپ رقابت کو مانتے ہیں تو آپ محبّت کو بھی مانتے ہیں اور محبت زندگی کا ایک حصّہ ہے۔ اس طرح تو آپ کو قائل ہونا پڑے گا کہ زندگی نہایت اہم چیز ہے۔"

"اب مثال کے طور پر میں آپ کو ایک قصّہ سنانے لگا ہوں۔ رقابت کے متعلق ـــــ!" 'ق' بولے۔

"ہم وہ قصّہ ضرور سنیں گے۔" امجد نے کہا۔ "لیکن ایک بات میں ضرور کہوں گا کسی دانا نے کہا ہے کہ انسان سب سے بڑی حماقت اُس وقت کرتا ہے۔ جب وہ

اپنے محدود تجربے سے بڑے بڑے نتیجے اخذ کرنے لگتا ہے۔ اب مجھے لیجئے اگر میں اپنے رقیب گننے لگوں تو گنتے گنتے تھک جاؤں۔ لیکن میں نے آج تک کسی کے متعلق کچھ بھی نہیں سوچا۔ میں تو محبوب اور رقیب دونوں کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہوں اور پھر دنیا میں محبت ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ بہتر اور ضروری چیزیں بھی ہیں۔ دنیا میں بے شمار دلچسپیاں ہیں اور اُن میں سے ایک محبت ہے اگر مل جائے تو غنیمت سمجھو۔ نہ ملے تو کوئی پروا نہیں۔"

"تمہاری اور بات ہے۔ معاف کرنا محبت کے متعلق تمہیں بولنے کا حق نہیں"۔

"اس لیئے کہ میں نے بہت سی لڑکیوں کو چاہا ہے۔ اور میری چاہت نہایت عارضی ہوتی ہے یہی نا؟ لیکن محبت کا جذبہ کون سا دائمی جذبہ ہے؟ اس میں استقلال کہاں ہے؟ ایک سخت سے لفظ پر محبت ختم ہو جاتی ہے۔ ذرا سی غلط فہمی یا شک پر پرانی سے پرانی دوستی ٹوٹ جاتی ہے۔ تم جو محبت پر اس قدر بھروسہ کرتے ہو۔ ہمیشہ اس کا سہارا لیتے ہو یہ بتاؤ اگر یہ تم سے چھین لی گئی۔ تب کیا کرو گے ممکن ہے کہ تمہارا اس سے جی بھر جائے اور یہ انسانی فطرت ہے کہ جس چیز کا جتنا شوق ہوتا ہے۔ اُتنی ہی جلدی اُس سے جی بھر جاتا ہے۔ آج سے چند سال پہلے

تمہیں اپنے کالج کے کلر جیتنے کا کتنا خبط تھا۔ ہر وقت تم اسی کوشش میں رہتے تھے اور جب تمہیں مل گیا تو تم نے اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ کچھ دنوں کے بعد تمہیں اسی طرح تصویروں سے چڑ ہو گئی۔ تم اپنے البم کو لے لو، کن مصیبتوں اور کس شوق سے تم نے وہ تصویریں جمع کی تھیں اور اب شاید تمہیں یہ بھی علم نہیں کہ وہ

کہاں پڑا ہے۔ میں حقیقت پرست ہوں۔ کبھی خواب نہیں دیکھتا ـــــ اور میرا عقیدہ یہی ہے کہ جو کچھ سامنے نظر آتا ہے۔ اُسی کے متعلق سوچو، اُسی سے مطمئن ہو جاؤ، اس سے دور مت جاؤ، خدا جانے کل آئے گا بھی یا نہیں اور ماضی جو تھا وہ کبھی کا دفن ہو چکا ہے۔ میں خوب ہنس کھیل کر وقت گزارتا ہوں محبّت بھی کرتا ہوں لیکن غم نہیں لگاتا مجھے بڑھاپے کا کوئی ڈر نہیں۔ بڑھاپے میں میرے دل میں جوانی کی ہزاروں ایسی حسین یادیں ہوں گی۔ جن سے میں جی بہلا لیا کروں گا اور جب اس دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آئیگا تو اس شان اور اس اطمینان سے جاؤں گا جیسے کوئی اچھی طرح سیر ہو کر دسترخوان سے اٹھتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ اُسے کوئی اُٹھنے کے لئے کہہ رہا ہے بلکہ اس لئے کہ اس کا جی بھر چکا ہے۔"

"کیا مصیبت ہے۔" دت صاحب اپنے سفید سر پہ ہاتھ پھیر کر بولے ـــــ "آخر تم لوگ ایک موضوع پر گفتگو کیوں نہیں کرتے۔"

"ق" نے سگرٹ سلگایا اور کش لگاتے ہوئے بولے ـــــ "چند روز کا ذکر ہے۔ میں ایک ایسے شخص سے ملا جسے دیکھے کئی سال گزر چکے تھے۔ جس سے میری پرانی واقفیت تھی، اُسے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ بالکل اچانک ہی مل گیا میرا جی چاہا کہ اس سے خوب باتیں کروں۔ پرانے دوستوں سے مل کر بڑی مسرّت ہوتی ہے۔ لیکن وہ اس قدر سرد مہری سے پیش آیا کہ میں حیران رہ گیا۔ اُس نے مجھے ایک سرسری نگاہ سے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ میں اُس کی طرف لپک رہا تھا میرا قدم وہیں کا وہیں رہ گیا۔ حالانکہ آج تک ہم کبھی نہیں لڑے تھے۔ یہاں تک کہ ہم میں کبھی ناملائم گفتگو بھی نہیں ہوئی تھی ـــــ!"

"وہ کون تھا ۔۔۔؟"

" وہ میرا رقیب تھا آج سے چند سال پہلے کا رقیب ۔ ہم دونوں ایک لڑکی کو چاہتے تھے ۔ لیکن دونوں ناکام رہے ۔ ویسے اُن دنوں ہم دونوں کے دل اُسکی محبت سے لبریز تھے ۔ ہم میں سے ہر ایک یہی سمجھتا تھا کہ صرف اُسے ہی پسند کیا جا رہا ہے ۔ میں اُسے بیوقوف سمجھتا تھا اور وہ مجھے ، مجھے یہ یقین تھا کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے ۔ اُدھر وہ بھی یہی سمجھتا تھا ۔ لیکن وہ مجھ سے زیادہ خوش قسمت تھا وہ میدان میں مجھ سے پہلے آ چکا تھا ۔ جب میں نے اُس لڑکی کو دیکھا تھا تو شیطان نے میرے کان میں پھونک دیا کہ اگر دنیا بھر میں اگر کوئی لڑکی تمہیں مل سکتی ہے تو وہ یہ ہے اِدھر اُدھر مت دیکھو ، کچھ نہ سوچو ۔ بس اس کا پیچھا مت چھوڑو ۔ مجھے صرف اُس کی صورت پسند تھی ۔ اُس کی سیرت کا نہ میں نے کبھی مطالعہ کیا نہ اُس کی ضرورت سمجھی اور جس روز میں پہلی مرتبہ اُس کے گھر تو میں نے اپنے رقیب کو دیکھا ۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بھانپ گیا ۔ اُسے احساس ہو گیا کہ مقابل میں کوئی آ پہنچا ہے ۔ وہ ایک معمولی شکل کا زرد رُو اور پستہ قد لڑکا تھا جس کی ہر بات میں نسوانیت تھی ۔ لیکن میں اُس کا حلیہ نہیں بتاؤں گا ۔ ممکن ہے اوروں کی نظروں میں وہ بہت اچھا ہو ۔ میں نے اُسے ایک رقیب کی نگاہوں سے دیکھا تھا ۔ اس لئے لازمی طور پر میں اُس کی برائیاں ہی بیان کروں گا ۔ بس اُس دن سے اُس کا زوال شروع ہو گیا ۔ اُس کا وہاں آنا جانا بند ہو گیا ، یہ نہ سمجھئے کہ اُس کے زوال کے ساتھ ساتھ مجھے عروج ہوتا گیا ، نہیں ! میں اپنی کوششوں ہی میں لگا رہا ۔ میرا حال بالکل کولھو کے بیل کا سا تھا ۔ اُچھل اُچھل کر میں بڑی مستعدی سے اس تگ و دو میں مصروف رہا ۔ لیکن کچھ

دیر کے بعد گھوم گھام کر وہیں آجاتا۔ ہم دونوں مختلف کالجوں میں پڑھتے تھے۔ کبھی راستے پر، سنیما میں، یا کہیں اور، اکثر مڈبھیڑ ہو جاتی تھی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ ہم ایک دوسرے کو سلام کرتے اور نگاہیں پھیر لیتے۔ بس اس سے زیادہ کبھی کچھ نہیں ہوا۔ ہم نے ایک دوسرے کو کبھی بُرا بھلا نہ کہا، نہ یہ ظاہر ہونے دیا کہ ہم رقیب ہیں جب تک وہ وہاں رہا مجھے یہی امید رہی کہ کبھی نہ کبھی اُسے ضرور بلاوا آئیگا اور ایک مرتبہ پھر وہ اُن نگاہوں میں جگہ پالیگا جنہوں نے اُسے گرا دیا تھا۔ ایک عجیب سا خیال تھا، رقیب سے دوستی پیدا کرنا — اور شاید ناممکن بھی۔ لیکن کئی مرتبہ میں نے یہ کوشش کی کہ اسے دوست بنالوں دیکھوں تو سہی اس کے خیالات کیسے ہیں۔ اس کی باتیں کیسی ہیں۔ یہ کیسا لڑکا ہے۔ لیکن جو خلیج ہمارے درمیان تھی۔ وہ جوں کی توں رہی — حتےٰ کہ میں نے سنا کہ وہ کہیں جا رہا ہے۔ اس سے مجھے کچھ افسوس ہوا۔ پتہ نہیں مجھے اپنے رقیب سے ہمدردی کیوں تھی۔ جب کبھی میں یہ سنتا کہ وہ بیمار ہے یا پریشان ہے تو میں متفکر ہو جاتا۔ میرا دل چاہتا کہ کسی طرح اس کی مدد کروں۔ لیکن وہ جھجک جو پہلے روز سے تھی ہمیشہ قائم رہی۔ جب وہ چلا گیا تو میرے لئے میدان اور بھی صاف ہو گیا۔ لیکن میں ایسا نکما اور بے کار ثابت ہوا کہ تین سال کی متواتر کوششوں کے باوجود ایک لڑکی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکا۔ میری ہر کوشش اُلٹی مجھ پر ہی ہنستی تھی۔ آخر میں تنگ آگیا۔ میں نے اپنے اوپر دل کھول کر لعنت بھیجی، پھر لاحول پڑھی اور وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد کبھی اُس کا خیال تک نہ کیا — "

"اور وہ لڑکی؟ — کیا اب بھی نہیں —؟"

"نہیں! اب کچھ نہیں رہا۔ لڑکپن کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ بالکل خواب کی طرح، آنکھوں کے سامنے ہو تو انسان ہر چیز پر ایمان لے آتا ہے۔ اور جب

کچھ عرصے کے بعد میں نے اس لڑکی کو دیکھا۔ اُس نے زبردستی میک اپ کر رکھا تھا۔ اُس نے اپنے گلابی ہونٹوں پر لپ سٹک لگا رکھی تھی۔ اپنے تمتمائے رخساروں کو اور سرخ کر رکھا تھا سیاہ کرتا محض اس لئے پہنا گیا تھا کہ گورے رنگ پر خوب سجے، اب نہ اُس مسکراہٹ میں وہ جاذبیت تھی۔ نہ اُس چہرے میں پہلی سی وہ بات تھی، مجھے وہ بالکل معمولی لڑکی معلوم ہوئی۔ اور لڑکیوں جیسی۔ میں نے اُسے ایک کونے میں بیٹھ کر غور سے دیکھا۔ ایک نقاد کی نگاہ سے۔ اب میری آنکھوں سے محبت کی پٹی اتر چکی تھی۔ میں بڑا حیران ہوا۔ کیا یہی وہ چہرہ ہے جس پر میں مرمٹا تھا؟ کیا خاص خوبی ہے۔ اس میں؟ میں کس چیز سے محبت کرتا تھا۔ مجھے اس لڑکی کی معصومیت پسند تھی — کہاں ہے وہ معصومیت؟ یہ ہونٹ، یہ بال، یہ چہرہ بالکل ایک معمولی چہرہ ہے یہ آنکھیں بالکل معمولی آنکھیں ہیں۔ آخر کیا بات تھی۔ جس پر میں نثار تھا؟ تب مجھے محسوس ہوا کہ میں دراصل اپنے دماغ کی کسی تخلیق سے محبت کرتا رہا تھا۔ اپنے تصوّر سے، کسی ذہنی تصویر سے، کسی غیر مادی شے سے اور اس لڑکی کی شبیہہ کو میں زبردستی اُس معیار تک لانا چاہتا تھا۔ لیکن کبھی میں نے اُسے غور سے نہیں دیکھا۔ جب دیکھا اُسے نورانی کرنوں میں گھرا ہوا پایا۔ جن سے میری آنکھیں چندھیا گئیں اور وہ کرنیں میری اپنی تخلیق تھیں۔ یہ ہرگز وہ لڑکی نہیں ہے۔ جس سے میں محبت کرتا تھا۔ یہ تو ایک معمولی لڑکی ہے صبح سے شام تک ایسی سینکڑوں لڑکیاں آنکھوں کے سامنے سے گزرتی رہتی ہیں۔ تب میں اپنی حرکتوں پر بڑا پچھتایا مجھے بڑا افسوس ہوا لڑکپن کی بے وقوفیوں پر دل ہی دل میں پشیمان ہوا......"

"تو کیا اب تمہیں اُس سے محبت نہیں رہی؟"

"محبت! میرے خیال میں مجھے آج تک کسی سے بھی محبت نہیں رہی۔ میں نے کبھی اس کا مزا نہیں چکھا۔ محبت وہ کمزور جذبہ ہرگز نہیں ہو سکتا جو میرے دل میں بارہا آیا ہے اور ذرا سی دیر کے بعد چلا گیا۔ اس عارضی خبط کو محبت نہیں کہہ سکتے شاید میں محبت کے مفہوم سے بھی ناواقف ہوں، اور پھر محبت اور حسن کا کوئی تعلق نہیں۔ حسن پرستی اور چیز ہے اور محبت اور چیز۔ مصیبت یہ ہے کہ ہم حسین لڑکیوں کو اس دنیا کی مخلوق تو سمجھتے ہی نہیں۔ نہ جانے ہم انہیں کیا سمجھتے ہیں۔ اسی لئے ہم اُن سے عجیب چیزوں کی توقع رکھتے ہیں۔ میں ایک اور حسین لڑکی کو چاہتا تھا اُسے دیوی سمجھتا تھا۔ ایک روز ہم اکٹھے چائے پی رہے تھے۔ اُس نے کیک کھاتے کھاتے بڑے زور سے ایک ڈکار لی، اتنے زور سے کہ سارا کمرہ گونج اُٹھا اور میرا سارا عشق وہیں بخارات بن کر اڑ گیا۔ توبہ توبہ کس قدر بدمذاقی ہے۔ ایک حسین لڑکی اور زور سے ڈکار لے ــــ بس اس خیال نے سب کچھ وہیں ختم کر دیا۔ پھر ایک اور حسین لڑکی سے واسطہ پڑا۔ اُس سے تو میں شادی کرتا کرتا بچ گیا۔ وہ ایک پارٹی میں میرے ساتھ بیٹھی تھی، ہم دونوں ایک میز کے گرد بیٹھے تھے۔ جہاں چار آدمیوں کو بیٹھنا چاہیئے تھا۔ ایک صاحب نے ستار بجانا شروع کیا اور میں بُت بن کر رہ گیا۔ اتنا اچھا ستار میں نے کبھی نہیں سنا۔ جب ستار ختم ہوا تو میں نے دیکھا کہ میز بالکل صاف تھی۔ وہ حسین لڑکی سب کچھ کھا چکی تھی۔ میری طبیعت اس قدر بیزار ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتا۔ اتنا اچھا ستار بج رہا ہے، لوگ مبہوت بنے بیٹھے ہیں۔ اور ایک حسین لڑکی دونوں ہاتھوں سے بے تحاشا کھا رہی ہے۔ اچھا! ایک اور

خاتون تھیں جنہیں چوبیس گھنٹے مجھ سے یہی شکوہ تھا کہ میں اُنہیں گھورتا رہتا ہوں۔ ارے بھئی! آپ اتنی اتنی دیر آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر میک اپ کس لئے کرتی ہیں، ایسے خوشنما لباس کیوں پہنتی ہیں، یہ طرح طرح کے رنگ یہ جگمگ جگمگ کرتے ہوئے زیور، یہ بناؤ سنگھار، آخر یہ سب کس لئے ہے؟ کیا آپ یہ چاہتی ہیں کہ آپ بن سنور کر نکلیں اور ہم آپ کو دیکھتے ہی اپنی آنکھیں میچ لیں، یا آپ پر لاحول پڑھنے لگیں۔ گھورنا تو ایک قسم کا خراج ہے۔ ایک قسم کا اعتراف ہے۔ کبھی کوئی بھدّے چہروں کو بھی گھورتا ہے؟ آپ خود رنگین پھولوں اور خوشنما پرندوں کو گھورتی ہوں گی۔ کبھی آپ نے کسی اُونٹ کو یا بھینس کو گھورا؟ اور پھر گھورتے وقت ہمارے خیالات کسی خاص رو میں تو بہتے نہیں۔ ہم کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔ یہی سوچتے ہیں کہ یہ چہرہ خوب ہے۔ ایسا چہرہ شاید پہلے بھی دیکھا تھا۔ کہاں دیکھا تھا، کہاں دیکھا تھا بھلا؟ —— اوہ! وہاں دیکھا تھا، لیکن اُس کی پیشانی کشادہ تھی۔ اُس کی آنکھیں اتنی حسین نہیں تھیں، اگر یہ لٹیں پریشان ہوتیں تو اچھا تھا —— اور وہ چہرہ؟ اب وہ لڑکی کہاں ہو گی؟ شاید اُس کی شادی ہو چکی ہو —— اور وہ جو اُس کی بڑی بہن تھی وہ —— بس اسی طرح نہ جانے ہم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے ہیں۔ ہماری آنکھیں ایک چہرے پر جمی ہوتی ہیں اور ہم سوچ کچھ اور رہے ہیں ——!"

"واقعی تم کچھ اور سوچ رہے ہو۔" دت صاحب بولے —— "ابھی ابھی تم کسی رقیب کا ذکر کر رہے تھے۔"

"ہاں! میں رقابت کا ذکر کر رہا تھا، میں نے بڑے بڑے خونخوار اور سنگدل

انسان دیکھے ہیں، جو آج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور کل آپس میں نہایت گہرے دوست بن گئے، لیکن رقابت میں صلح ناممکن ہے۔ کچھ اجنبیت سی آجاتی ہے جو ہمیشہ رہتی ہے۔ چند روز ہوئے جب میں اپنے رقیب سے ملا تو اُس نے فوراً آنکھیں پھیر لیں، اور یہ ظاہر کیا جیسے وہ مجھے بالکل نہیں پہچانتا۔ اُس کے ساتھ جو لڑکا تھا میں اُسے جانتا تھا۔ میں کچھ دیر اُس دوسرے لڑکے سے باتیں کرتا رہا۔ اتنی دیر اُس نے اپنی نگاہیں مجھ سے دور رکھیں۔ اُس کی نگاہوں میں ایسی سرد مہری تھی۔ جو کسی شدید ترین جذبے کو ظاہر کرتی تھی اور وہ جذبہ نفرت کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے اب میں سوچتا ہوں کہ ہماری دوستی ناممکن تھی۔ نہ ہم کبھی دوست بن سکتے تھے۔ اور نہ کبھی بن سکیں گے۔ لیکن اب بھی میرے دل میں یہ خواہش ہے کہ میں اُس کی باتیں سنوں اس کے خیالات معلوم کروں۔ بھلا یہ کیسا لڑکا ہے؟ —— یہ اُنس یا لگاوٹ جو بھی آپ سمجھیں، نہایت ہی عجیب ہے۔ میں نے سنا تھا کہ اُس لڑکے کی کسی اور جگہ منگنی ہو چکی ہے اور اب عنقریب شادی ہونے والی ہے۔ شاید یہ بھی میری طرح اُس لڑکی کو بھول چکا ہو گا۔ اور اس وقت ہم دونوں ایک جیسے ہیں، دونوں اپنی کوششوں میں ناکام رہے۔ دونوں کو اُس لڑکی نے ٹھکرا دیا، اور اب دونوں اُسے بھول چکے ہیں، دونوں ایک اجنبی علاقے میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں پھر یہ بے رُخی کیسی؟ پھر اس سرد مہری کا مطلب؟ میرے خیال میں تو اب کوئی تلخی یا دشمنی باقی نہیں رہنی چاہئے۔ لیکن وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے، پہلے سے زیادہ نفرت کرتا ہے۔ اسی لئے وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا بھی نہیں۔ اور میں ہوں کہ مجھے نہ جانے کیا خبط ہے، مجھے اس سے اس قدر اُنس کیوں ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ مجھ سے

زیادہ خوش قسمت رہا ہے۔ چند لمحوں کے لئے اُسے اس لڑکی کا قرب بھی حاصل ہوا ہے جس کے لئے میں ہمیشہ ترستا رہا۔ اور جو کچھ اس کے دل میں تھا اُس نے اپنی زبان سے کہہ دیا۔ اُسے اظہارِ محبت کا موقع بھی ملا تھا۔ اور وہ مجھ سے پہلے میدان میں آ چکا تھا۔ یا شاید اس لئے کہ کوئی چیز ہم دونوں میں یکساں ہے۔ کوئی جذبہ یا کوئی کمزوری! یا شاید اس لئے کہ وہ میری حماقتوں کا رازدان ہے، اُسے معلوم ہے کہ میں نے کبھی کیسی عجیب عجیب حرکتیں کی تھیں؟ میں ایک وقت نہایت احمق رہ چکا ہوں۔ ممکن ہے کہ میں صرف اس لئے بے چین ہوں کہ اس بے رخی کا سبب دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ آخر وہ اب مجھ سے کیوں نفرت کرتا ہے۔ اِس کی وجہ محض رقابت ہے یا کوئی اور بات ہے۔ آپ سب دل میں ہنس رہے ہونگے میں آج کس قدر بے معنی باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے اُس لڑکی کا کوئی خیال نہیں رہا جس کی وجہ سے یہ رقابت شروع ہوئی۔ لیکن اپنے رقیب سے اُنس ہے جسے میری طرح ٹھکرا دیا گیا۔ جو مجھ سے نفرت کرتا ہے ـــــ کتنی عجیب بات ہے؟"

"تم نوجوانوں سے خدا بچائے۔" دت صاحب کرسی کا سہارا لے کر اُٹھتے ہوئے بولے۔" اور پھر خصوصاً کنواروں سے۔ تمہاری باتیں کتنی بے ربط ہیں۔ کتنی بے معنی ہیں؟ ـــــ ان کا نہ سر ہے نہ پیر ـــــ!"

مسافر

میں دوپہر سے وہیں بیٹھا تھا۔ اتوار کا دن تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد سب اِدھر اُدھر چلے گئے۔ میں کچھ رسالے لے کر باہر دھوپ میں جا بیٹھا۔ آسمان بالکل صاف تھا اور سورج پوری تیزی سے چمک رہا تھا۔ پھر بھی سردی محسوس ہو رہی تھی وہ پہاڑی علاقہ اس قدر سرد تھا کہ دھوپ کا وجود بیکار سا لگتا تھا۔

اُس مختصر سی آبادی میں آئے مجھے تین مہینے ہو چکے تھے۔ ہم چار پانچ لڑکوں نے مل کر ایک چھوٹا سا میس بنا لیا تھا جہاں ہم کھانا کھاتے اور موقع مل جاتا تو کبھی کبھار تاش کھیل لیتے یا اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہتے۔ وہ جگہ بالکل ویران تھی۔ چاروں طرف کئی کئی سو میل تک کوئی آبادی نہیں تھی۔ خشک اور بنجر پہاڑ جن پر سبزہ نام تک کو نہ تھا۔ محض چٹانیں ہی چٹانیں تھیں کہیں کہیں ریتیلا علاقہ بھی تھا۔ دسمبر کے آخری

ہفتے سے برف باری شروع ہو جاتی تھی۔ اور فروری مارچ تک رہتی تھی۔ برفباری کے وقت اتنی سردی نہیں پڑتی تھی۔ لیکن اس کے بعد جو تیز ہوا چلتی اُس سے ہڈیوں کا گودا تک جم جاتا بعض اوقات تو کئی کئی دن برفباری ہوتی اور پھر جو ہوا چلنی شروع ہوتی تو بند ہونے میں نہ آتی۔

ایسی ویران جگہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ تنہائی سے تنگ آکر بعض دفعہ تو دل میں ہول اُٹھنے لگتا، ایسی وحشت سوار ہوتی کہ جی چاہتا کوئی دوست مل جائے کسی اجنبی سے مڈبھیڑ ہو جائے۔ یا کوئی مسافر ہی نظر آجائے جس سے دو چار باتیں کر لیں۔ انسانی شکل دیکھنے کو ترس جاتے تھے۔ ہمیں باہر دورے پر بھی جانا پڑتا تھا۔ موٹر میں یا پیدل۔ خواہ کتنی دور چلے جاتے۔ سیاہ چٹانوں اور صحراؤں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آتا۔

کام اس قدر زیادہ تھا کہ آپس میں مل بھی نہیں سکتے تھے۔ سب کے کام مختلف تھے۔ اکثر یہی ہوتا کہ ایک آیا کچھ دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ دوسرا آیا وہ بھی چلا گیا۔ اسی طرح ہم کھانا بھی تنہا کھاتے اور تنہا ہی بیٹھے رہتے۔

ہم لڑکوں کے علاوہ میس کے ایک اور بھی ممبر تھے۔ انجنیئر صاحب! جو مہینے میں فقط دو چار دنوں کے لئے آیا کرتے تھے۔ اُن کا کام ہم سب سے زیادہ تھا۔ اُن کا زیادہ وقت باہر دوروں میں گزرتا تھا۔ اُن کا علاقہ اس قدر طویل و عریض تھا۔ کہ ہمیں تعجب ہوتا تھا کہ وہ اس قدر کام کس طرح کر لیتے ہیں۔ اُن کی عمر پینتالیس یا پچاس برس کے لگ بھگ ہو گی درمیانہ قد، دوہرا جسم۔ چہرے پر جھریاں پڑی ہوئیں سر کے

بال بالکل سفید تھے۔ چہرے پر ہمیشہ ایک ایسی اُداسی چھائی رہتی۔ جس میں شفقت اور محبّت کی جھلک ہوتی۔

اس عمر میں انہیں اتنی سخت محنت کرتے دیکھ کر مجھے ترس آجاتا۔ لیکن ہم آپس میں بالکل اجنبی تھے۔ اس لئے میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔ سب لڑکے انہیں "مسافر" کہتے تھے۔ ہم میں سے شاید کسی کو اُن کا اصلی نام معلوم نہیں تھا۔ بس ہم انہیں مسافر ہی کہتے تھے اور وہ تھے بھی بالکل مسافر۔ آج یہاں ہیں کل یہاں سے پچاس میل کے فاصلے پر، پرسوں کہیں اور۔ نہ ہم نے اُن کے نام کوئی خط آتا دیکھا نہ ہی غالباً وہ کسی کو خط لکھتے تھے۔

میں دوپہر سے باہر ایک پلاٹ میں بیٹھا تھا۔ کچھ رسالے میری گود میں پڑے تھے اور کچھ گھاس پر۔ نہ پڑھنے کو جی چاہتا تھا اور نہ سوچنے کو، سوچنے کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ دن ڈھل چکا تھا اور خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔

میرے چاروں طرف سوکھے ہوئے درخت کھڑے تھے جن کے پتے اور ٹہنیاں برف نے جلا دی تھیں۔

میں نے اتنی شدت کی برفباری صرف وہیں دیکھی تھی۔ جس روز برف پڑنا ہوتی اُس روز آسمان پر گھٹا یوں پھیل جاتی جیسے گہری دھند چھا جاتی ہے۔ پہلے ہلکی ہلکی بوندیں پڑتیں۔ پھر ننھے منے سفید گالے گرنے لگتے۔ بالکل روئی کے گالوں کے سے! یہ گالے بڑے ہو جاتے۔ اور پھر مکان، درخت، سڑکیں، تاروں کے کھمبے سب سفید ہو جاتے، چاروں طرف برف ہی برف دکھائی دیتی۔ وہاں پہلے ہی گنے گنائے آدمی رہتے تھے۔ برفباری کے بعد وہ سب گھروں میں دبک جاتے اور چاروں طرف

سناٹا چھا جاتا۔

میں نے کئی خوبصورت نظارے بھی دیکھے تھے۔ ایک دفعہ برف پڑ رہی تھی۔ یکایک ایک بادل پھٹا اور چاند جھانکنے لگا۔ چاندنی میں برفباری ایک ایسا نظارہ تھا۔ جسے بھلایا نہیں جا سکتا۔

پھر ایک مرتبہ بڑی سخت برفباری ہوئی۔ ساری رات برف پڑتی رہی۔ علی الصبح یک لخت گھٹا صاف ہو گئی اور پھر برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں میں سے سورج طلوع ہوا۔ ویسے شوخ رنگ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ طرح طرح کے رنگ تلملاتے ہوئے، مچلتے ہوئے رنگ۔ آنکھیں خیرہ کر دینے والے، قوس قزح کے رنگ، نئے نئے رنگ دیکھے اور پھر دھوپ میں برف اس قدر چمکنے لگی کہ سیاہ عینک لگانی پڑی۔

میں نے رسالے زمین پر پھینک دیئے اور ایک سگریٹ سلگایا۔ میں دوپہر سے بے شمار سگریٹ پی چکا تھا۔

سامنے پہاڑیوں کے پیچھے سورج غروب ہو رہا تھا۔ شفق سے آسمان کا وہ حصہ جگمگا رہا تھا۔ میری نگاہیں ایک انسانی سائے پر جم گئیں جو متحرک تھا۔ پہاڑ سے جو پیچیدہ پگڈنڈی بل کھاتی ہوئی نیچے اُترتی تھی۔ اُس پر کوئی آ رہا تھا ــــ کوئی مسافر۔

ایک مسافر کو آتے دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ میں اُسے دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ بالکل قریب آ گیا۔ اندھیرا ہو چلا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ لیکن میں اُس مسافر کا

منتظر تھا۔ ارے! انجنیئر صاحب؟ — جنہیں ہم مسافر کہا کرتے تھے۔ یہ کہاں سے آرہے ہیں؟ — میں نے سلام کیا، اُنہوں نے بڑے ملائم لہجے میں جواب دیا۔ وہ دھول میں اَٹے ہوئے تھے۔ چہرہ اُترا ہوا تھا۔ چہرے کی جھریاں زیادہ نمایاں ہوگئی تھیں۔ وہ بہت زیادہ تھکے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔

ہم دونوں انگیٹھی کے پاس بیٹھ گئے۔ میرے ساتھی غالباً باہر دورے پر چلے گئے تھے۔ ہم دونوں وہاں دیر تک بیٹھے رہے۔ مجھے پہلی مرتبہ اُن سے اچھی طرح باتیں کرنے کا اتفاق ہوا۔ پہلی مرتبہ اُن سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور میرے دل میں طرح طرح کے خیالات آنے لگے۔ یہ ایسے علاقے اور ایسے کام کیوں پسند کرتے ہیں؟ اس عمر میں اس قسم کی زندگی اُنہیں کیونکر راس آتی ہوگی۔ ان کے بال بچے بھی تو ہوں گے۔ شاید مجھ جتنے تو ان کے لڑکے ہوں۔ لیکن اُن کے خط کیوں نہیں آتے۔ ان کے عزیز انہیں خط کیوں نہیں لکھتے۔ اتنے دنوں سے ان کے نام ایک بھی تو خط نہیں آیا۔

اُن کی آنکھوں میں بے حد شفقت تھی، جو چہرے کی اُداسی کو اور بھی نمایاں کر رہی تھی۔ اُن کے چہرے پر وہ شان بھی تھی۔ جو بزرگوں کے چہروں پر ہوتی ہے وہ جلال اور عظمت جو عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی جاتی ہے۔

اُن کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی۔ وہ کبھی شکایت نہیں کرتے تھے۔

اُن کی گفتگو اس قدر سادہ اور خیالات اتنے سلجھے ہوئے تھے کہ میں بہت

متاثر ہوا۔ وہ صبح سے بھوکے تھے۔ دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر چلے تھے۔ لیکن راستے میں اُنہیں کوئی مسافر مل گیا جس کے پاس کھانا نہیں تھا۔ چنانچہ یہ اسے دے آئے۔

"اُس کی عمر کیا تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی تیس بتیس برس کا ہوگا"

وہ آپ سے کہیں چھوٹا تھا اور آپ کی نسبت بھوک اچھی طرح برداشت کر سکتا تھا"

"لیکن وہ بھوکا تھا۔ میں ناشتہ کر کے چلا تھا اور اُسے کوئی ناشتہ نہیں ملا تھا۔ اگر میں اُسے کھانا نہ دیتا تو کئی دنوں تک یہ پچھتاوا میرے دل میں رہتا۔ تم کبھی بھوکے رہے ہو؟"

"نہیں! سوائے روزوں کے میں کبھی بھوکا نہیں رہا۔!"

"روزوں کی بھوک تو محض تفریح ہوتی ہے' تم اندازہ نہیں لگا سکتے کہ بھوک کیسی ہوتی ہے' اور اگر بھوک کے ساتھ ساتھ بہت سے فکر بھی ہوں تب تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا آجاتا ہے۔ مجھے اس کا ایک دو مرتبہ تجربہ ہو چکا ہے جب کبھی تم کسی بیکس کو کہیں دیکھو تو ضرور کچھ نہ کچھ دیدیا کرو۔ اگر تم کہیں چھپ کر دیکھ سکو تو ضرور دیکھنا کہ ایک پیسے یا ایک آنے کا اُس پر کیا اثر ہوتا ہے۔ وہ حقیر سی رقم جو تمہارے کسی مصرف کی نہیں۔ ایک غریب کو کتنی ڈھارس پہنچاتی ہے۔ اُسے گویا دنیا مل جاتی ہے۔ اور پھر انسان ضرورت کے وقت انسانوں ہی کے منتظر رہتے ہیں' انسان ہی انسان کی مدد کر سکتا ہے۔ کبھی کوئی فرشتہ آکر

اُس کا ہاتھ نہیں تھام لیتا۔ اور بعض لوگ تو روپے پیسے بھی نہیں مانگتے۔ وہ صرف تسلی کا ایک لفظ یا ذرا سی ہمدردی چاہتے ہیں۔ کسی غمگین اور پژمردہ شخص کو تنہائی میں بیٹھا دیکھو تو سمجھ لو کہ وہ چند محبت بھرے الفاظ کا طالب ہے۔ تم اُس سے ذرا پیار سے بول لئے تو وہ اپنا سارا دکھ درد بھول جائے گا۔ دنیا میں مشکل سے کوئی دل ایسا ہوگا جسے ہمدردی کی ضرورت نہ ہو۔ ہمدردی ایسی کنجی ہے جس سے ہر دل کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اور یہی چھوٹی چھوٹی مہربانیاں اور ہمدردیاں ہیں جن کی توقع ہمارے بھائی انسان ہم سے رکھتے ہیں۔ اگر تم سال میں دو تین مرتبہ بڑی بڑی رقمیں کسی کو دیدو یا ایک آدھ مرتبہ کسی کی مدد کر دو وہ اتنا اچھا نہیں جتنی یہ چھوٹی موٹی نیکیاں ہیں جو ہمیں ہر روز کرنی چاہئیں۔"

کھانا تیار تھا۔ ہم میز پر جا بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد قسمت پر باتیں ہونے لگیں۔ میرا یہ عقیدہ تھا کہ یہاں سب کچھ مقررہ ہے۔ جو خوش قسمت ہے اُس کی پیشانی پر لکھ دیا گیا ہے کہ وہ ہمیشہ اور ہر جگہ جیتے گا۔ اور جو بد قسمت ہے اُس کی تقدیر کبھی نہیں بدل سکتی۔

اُن کا نظریہ مختلف تھا۔ وہ بولے — "ہم سب انسان ایک جیسے ہیں آسمان اور زمین کے درمیان جتنی مخلوق سانس لیتی ہے اُن میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ اُن میں ایک حد تک یکسانیت ہے۔ ہم سب غلطیاں کرتے ہیں۔ ہم سب میں خوبیاں ہیں۔ ہم سب میں کمزوریاں ہیں۔ فرق یہ ہے کہ کسی میں قدرے زیادہ ہیں اور کسی میں ذرا کم۔ اور یہ ذرا سا فرق ہماری کمزور آنکھوں کو بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح تقدیر بھی ہے۔ ہم سب خوش قسمت بھی ہیں اور بد قسمت بھی

ہمیں ایک ہی لاٹھی سے ہانکا جاتا ہے۔ اور تصویر کا کون سا رُخ ہمیں پسند ہے۔ اس کا انحصار ہم پر ہے۔"

اُن کی سیدھی سادھی گفتگو مجھے اس قدر پسند آئی کہ میں دیر تک اُن سے باتیں کرتا رہا۔ وہاں سے اُٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا۔

جب ہم باہر نکلے تو سخت سردی تھی۔ وہ اپنا اوورکوٹ غالباً اپنے سامان میں چھوڑ آئے تھے۔ جو ان کے عملے کے پاس تھا۔ میں نے اپنا اوورکوٹ دینا چاہا وہ نہ مانے۔ میں نے اصرار کیا۔ اور بڑی مشکل سے انہیں پہنایا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں انہیں سردی نہ لگ جائے۔ میں انہیں اُن کے کیمپ تک چھوڑنے گیا۔

اگلے روز جب میں علی الصبح کام پر جا رہا تھا تو وہ مجھے ملے، وہ صبح کی سیر سے واپس آ رہے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں ایک پھول تھا جو انہوں نے مجھے دیدیا۔

"اس ویرانے میں یہ پہلا پھول ہے جسے میں نے اس موسم میں دیکھا ہے، شاید بہار آنے والی ہے۔ میں اسے تمہارے لیے لایا ہوں۔"

مدت کے بعد میں نے ایک مسکراتا ہوا شگفتہ پھول دیکھا تھا، مجھے یہ سادہ سا تحفہ بہت پسند آیا، میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔

دوپہر کو کھانے پر جب وہ آئے تو اُن کی آواز بھاری تھی، شائد انہیں سردی لگ گئی تھی۔ دو تین روز وہ علیل رہے اور مجھے تیمار داری کا موقع مل گیا۔ اس دوران میں انھوں نے بڑی اچھی اچھی باتیں سنائیں۔ لیکن اُن کے متعلق ایک بات اب تک پُر اسرار بنی ہوئی تھی —— ایک راز جسے میں

پوچھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ اُن کی گذشتہ زندگی کا راز! میں نے کئی مرتبہ کوشش بھی کی۔ لیکن دریافت کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

انہوں نے اپنی موجودہ زندگی کے متعلق بہت کچھ بتایا۔ انہیں سات آٹھ سو تنخواہ ملتی تھی وہ اس علاقے میں دو سال سے تھے۔ لیکن اُن کے پاس ایک پائی بھی جمع نہ تھی۔ وہ اپنی ساری تنخواہ مزدوروں اور غریبوں میں بانٹ دیتے تھے، یہاں تک کہ بعض اوقات انہیں اپنی ضروریات کے لیے قرض لینا پڑتا تھا۔

"اور جب میں روپے بانٹتا ہوں تو میرا دل بلّیوں اچھلنے لگتا ہے۔ دنیا میں بے شمار مسرتیں ہیں۔ لیکن سب سے بڑی مسرت وہ ہے جو کسی کی مدد کرنے کے بعد محسوس ہوتی ہے۔"

انہوں نے میری اداسی کا سبب پوچھا، اور میں نے بیسیوں وجوہات گنوا دیں۔ تنہائی، بیزاری، ناکامی، یہ اور وہ۔

"شاید تم امید کھو بیٹھے ہو، کیوں؟"

اور میں نے سر ہلا دیا۔

"امید ترک کر دینا گناہ ہے۔ کیونکہ امید بذاتِ خود ایک بہت بڑی خوشی ہے، بہت بڑا تحفہ ہے۔ امید سورج کی طرح ہے۔ جس کی طرف اگر ہم چلے جائیں تو ہمارے رنج و غم سائے کی طرح پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اس سے ہماری خوشیاں دگنی اور غم آدھے رہ جاتے ہیں۔ اور مایوسی تو ایک جرم ہے، کیونکہ مایوس رہ کر تم دوسروں کو بھی مایوس کر دیتے ہو۔ اس کے جراثیم بڑے مہلک ہیں، مایوس چہرہ دیکھ کر دل میں مایوسی پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ایک مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ کر آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ خواہ مخواہ مسکرانے لگتے ہیں۔ سورج کو دیکھو جب طلوع ہوتا ہے تو کیسی کیسی مسرتیں تقسیم کرتا ہے۔ اگر کسی طرح مسرور نہیں رہ سکتے تو اسے اپنی ڈیوٹی سمجھ لو۔ لیکن مسرور رہو، اور امید کو کبھی نہ چھوڑو۔ اگر تمہیں خدا پر بھروسہ ہے تو امید پر بھی بھروسہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ امید خدا کا عطیہ ہے۔ اور ہم فانی انسانوں کے پاس سب سے بڑا سرمایہ امید ہی ہے۔"

ہم دیر دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ایسے سبق مجھے آج تک کسی نے نہیں دیئے تھے، اُن کی چھوٹی چھوٹی باتیں گویا میری روح میں تیر جاتی تھیں۔ ہر صبح وہ میرے لئے ایک چھوٹا سا تحفہ لاتے تھے۔ جس سے مجھے اتنی مسرت ہوتی تھی کہ میں سارا دن خوش رہتا تھا۔

ایک روز انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ جا رہے ہیں۔ اُن کا عملہ رات کو چل دیگا اور وہ علی الصبح جائیں گے۔ راستے خراب تھے۔ اس لئے انہیں دو روز تک پیدل چلنے کے بعد لاریاں مل سکتی تھیں۔

وہ پہلی مرتبہ وہاں ایک ہفتہ ٹھہرے تھے۔ یہ اُن کا سب سے طویل قیام تھا رات کو ہم کھانے کے بعد انگیٹھی کے سامنے بیٹھے تھے۔

"پھر کب ملاقات ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"شاید اب کبھی ملاقات نہ ہو، کیونکہ میرا یہاں سے تبادلہ ہو گیا ہے اور میں بہت دور جا رہا ہوں۔ تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ تم مجھ پر بے حد مہربان رہے ہو۔ میں ان چھ سات دنوں کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر تم میرا اتنا خیال نہ رکھتے

تو میں اتنی جلدی کبھی اچھا نہ ہوتا۔"

میں بے حد مغموم ہو گیا۔ مجھے اُن کے جانے پر رنج ہو رہا تھا۔ تب میں نے یکایک اُن سے ایک سوال پوچھ لیا اُن کی گذشتہ زندگی کے متعلق۔ انہیں یہ زندگی کیوں پسند ہے۔ یہ ملازمت کیوں پسند ہے۔ اِس عمر میں وہ کِس لئے یوں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ اُن کے نام کوئی خط کیوں نہیں آتا۔ وہ اپنے مستقبل کے لئے روپیہ کیوں نہیں جمع کرتے؟——

اور انہوں نے اپنی زندگی کی داستان مجھے سنائی۔ وہ بمبئی میں کسی ادارے کے صدر تھے، خود مختار تھے۔ بڑی باعزت ملازمت تھی۔ ہمیشہ بمبئی میں رہتے تھے بڑی پرسکون اور آرام کی زندگی تھی۔ بہت بڑا عملہ اُن کے نیچے کام کرتا تھا۔ پھر یکایک اُن کی بیوی کا انتقال ہو گیا۔

"اور جب اُن کا انتقال ہوا تو میں باہر ایک جگہ مدعو تھا۔ بمبئی سے پندرہ بیس میل کے فاصلے پر۔ میں وہاں دو روز کے لئے گیا ہوا تھا۔ خبر سنتے ہی میں فوراً واپس پہنچا، اور میں نے دیکھا کہ وہ چپ چاپ بستر پر لیٹی ہوئی تھیں، نہ وہ بیمار ہوئیں۔ نہ انہیں کوئی تکلیف ہوئی۔ بس بیٹھے بیٹھے پل بھر میں انہوں نے جان دے دی۔ جتنی پُرسکون اُن کی زندگی تھی اُتنی ہی پرسکون اُن کی موت تھی۔ لیکن مجھے ایک بات کا پچھتاوا رہ گیا۔ کاش میں اُس وقت اُن کے پاس ہوتا۔ اگرچہ یہ خیال بالکل فضول ہے کہ میں انہیں مرنے سے بچا لیتا۔ لیکن یہ خیال میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اگر میں وہاں ہوتا تو شاید انہیں مرنے نہ دیتا۔ کچھ ہماری محبت ہی ایسی تھی۔ اُن کی موت کے بعد میں کچھ دنوں تو بے حد غمگین رہا۔ پھر جیسے دل خود بخود سنبھل گیا۔ لیکن مجھے اُس

گھر سے نفرت ہو گئی۔ اُن کمروں سے۔ اُس سامان آرائش سے۔ یہاں تک کہ مجھے اُس سڑک سے نفرت ہو گئی۔ جس پر ہماری کوٹھی تھی۔

اور یہ نفرت اس قدر بڑھ گئی کہ میں نے تنگ آ کر مکان بدل دیا۔ اب مجھے اپنی ملازمت بُری معلوم ہونے لگی۔ وہاں میرا جی نہ لگتا تھا۔ اپنا عملہ، اپنا کام، ہر چیز بُری لگتی تھی۔ مجھے بمبئی سے نفرت ہو گئی۔ اور بمبئی کے گرد و نواح سے بھی۔ جہاں ہم دونوں اکثر گھوما کرتے تھے۔ مجھے وہاں کی ہر چیز کاٹنے کو دوڑتی تھی۔ میں نے اپنی ملازمت سے استعفےٰ دیدیا۔ اور ایک گاؤں میں چلا گیا۔ نہ میرا کوئی بچّہ تھا اور نہ کوئی نزدیکی رشتہ دار۔ میری ساری محبت اپنی بیوی کے لئے وقف تھی۔ جو مجھے تنہا چھوڑ کر سدھار چکی تھی۔ اور اب انہیں کھو کر میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہا تھا۔ مجھے اپنی منزل کا پتہ نہیں تھا۔ راستے کا کیا پتہ ہوتا۔ وہ گاؤں بمبئی کے نزدیک ہی تھا، وہاں بمبئی کا ذکر ہوتا رہتا تھا۔ بمبئی کی گاڑیاں وہاں سے گزرتی تھیں۔ وہاں بھی میرا جی نہ لگا آخر میں وہاں سے چلا آیا۔ بہت دور چلا آیا۔ کسی نے مشورہ دیا اور میں نے موجودہ ملازمت قبول کر لی۔ اب یہ لوگ مجھے کہیں بھیجدیں۔ کتنا ہی کام دیدیں، بس میں بمبئی نہیں جانا چاہتا۔ میں وہاں کبھی نہیں جاؤں گا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ سوائے شعلوں کی آواز کے جو انگیٹھی میں تڑپ رہے تھے

"اور اب ان بازوؤں میں کچھ باقی نہیں رہا۔ میرے قدم بعض اوقات جواب دیدیتے ہیں۔ اس جسم میں وہ دم خم نہیں رہا۔ سر کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ میں ایک عرصے سے بوڑھا ہو چکا ہوں۔ لیکن انہیں مجھ پر ناز تھا۔ انہیں میری ہمّت اور دلیری پر فخر تھا اور اب جب میں تھک ہار کر کہیں پناہ لینا چاہتا ہوں تو اچانک مجھے اُن کا خیال

آجاتا ہے۔ اگر اُن کی روح کہیں مجھے دیکھ رہی ہو تب؟ بس یہ خیال ہے جس سے میں زندہ ہوں۔ یہی کہ شاید وہ میرے قریب ہی رہتی ہیں، میں انہیں خواب میں بھی دیکھ لیتا ہوں۔ اگر میں کسی روز کوئی بہت اچھا کام کروں تو وہ مسرور نظر آتی ہیں۔ جن دنوں میں بیحد غمگین تھا کئی لوگوں نے شراب کا ذکر کیا۔ لیکن شراب تو ایک طرف میں سگریٹ تک نہیں پیتا۔ کیونکہ انہیں ان دونوں سے نفرت تھی، میں ہر وقت مسکراتا رہتا ہوں۔ اور میری یہی کوشش رہتی ہے کہ دوسرے بھی مسکرانے لگیں۔ اُنہیں مسکراتی ہوئی چیزیں پسند تھیں۔ وہ خود بے انتہا مسرور رہتی تھیں بیکسوں کی مدد، دوسروں کا غم بانٹ لینا، انسانی ہمدردی ـــــ یہ سب انہوں نے مجھے سکھائی تھیں"۔

"لیکن آپ کا کام بہت زیادہ ہے۔ یہ ملازمت آپ کے لئے بہت سخت ہے۔!"

"میں مانتا ہوں، لیکن زندگی کا سفر بھی تو کسی نہ کسی طرح طے کرنا ہے۔ منزل تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمّت ہار کر بیٹھ جانا بزدلی ہے۔ اور گھٹنے یا لڑکھڑانے سے سفر ہرگز کم نہ ہوگا، بلکہ اور مشکل ہو جائے گا"

اُس رات سخت برفباری ہوئی۔ ساری رات برف کے بڑے بڑے گالے تیزی سے گرتے رہے۔ رات بھر میں اُن کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ دفعتاً مجھے خیال آیا کہ انہوں نے اپنے ناشتے کا تو کوئی انتظام کیا ہی نہیں میں اٹھا۔ نوکروں کو جگایا۔ جو کچھ مل سکا اکٹھا کیا۔ ناشتہ تیار کر کے ایک تھیلے میں بند کیا۔ صبح پانچ بجے سے میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ البتہ برف کی چمک

سے نہایت مدھم روشنی ہو رہی تھی۔ بلا کی سردی پڑ رہی تھی۔

پورے چھ بجے میں نے انہیں جاتے دیکھا، وہ اپنے سیاہ لبادے میں لپٹے ہوئے تھے دوڑ کر میں اُن سے ملا۔ ناشتے کا تھیلا اُنہیں دیا تو وہ بہت خوش ہوئے میں کچھ دور اُن کے ساتھ گیا۔ جہاں سے چڑھائی شروع ہوتی تھی وہاں انہوں نے مجھ سے واپسی کے لئے کہا۔

اُنہوں نے میرا بہت شکریہ ادا کیا، اور وعدہ کیا کہ وہ مجھے کبھی نہ بھولیں گے۔ آسمان سے برف کے بڑے بڑے گالے گر رہے تھے۔ خون منجمد کر دینے والی سرد ہوا چل رہی تھی۔ چاروں طرف برف ہی برف تھی۔ اس اُجلے ماحول میں اُن کا سیاہ لبادہ دور تک نظر آتا رہا۔

اور میں دیر تک وہیں کھڑا اس مسافر کو دیکھتا رہا۔ جو زندگی کے راستے کو نہایت دلیری سے طے کر رہا تھا۔

مدّ و جزر

میں پورے آٹھ سال کے بعد ان حدود کو عبور کر رہا تھا، وہی حدود ــــــ جہاں سے کبھی میں بے حد غمگین گذرا تھا۔ لیکن اب مسکراتا ہوا آ رہا تھا۔ اور ان آٹھ سالوں نے مجھے ایک پگلے سے لڑکے کی بجائے ایک جہاندیدہ اور تجربہ کار نوجوان بنا دیا تھا، میں نے نئے نئے ملک دیکھے تھے نئے نئے آدمیوں سے ملا تھا۔ طرح طرح کی باتیں سیکھی تھیں۔ اب میں ایک نئی دنیا میں سانس لے رہا تھا۔ جو پہلی دنیا سے بالکل نرالی تھی۔

میں ٹرین کی کھڑکی سے باہر دیکھا، گزرتے ہوئے سٹیشنوں کو، پہاڑوں کو، پلوں کو، سرنگوں کو ــــــ مجھے ایک ایک چیز یاد تھی۔ ان سب کا نقشہ ہوبہو میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ میں نے اُن چیزوں کو اتنی مرتبہ دیکھا تھا کہ سب کچھ یاد ہو گیا تھا۔

وہ مخصوص شکل کی چوٹیاں، وہ لہراتی ہوئی ندیاں —— وہ جنگل، سب کچھ وہی تھا، بالکل وہی —— جو آج سے آٹھ سال پہلے تھا۔ لیکن حالات کس قدر مختلف تھے۔ تب میں زندگی سے بیزار تھا۔ میرا نظریۂ حیات شکست خوردہ تھا، تب مجھے دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی۔ زندہ رہنے کی تمنا نہ تھی، چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ لیکن اب میری آنکھوں میں نور ہے، سورج فقط میرے ہی لئے چمکتا ہے، پھول محض میرے ہی لئے مسکراتے ہیں، ستارے محض میرے ہی لئے جھلملاتے ہیں اور دن رات کا یہ عجیب کھیل، یہ نور و ظلمت کا امتزاج یہ صرف میرے ہی لئے ہے۔

دراصل یہ دنیا نہ تو غمکدہ ہے اور نہ راحت کدہ۔ نہ یہاں رنج بٹتے ہیں اور نہ خوشیاں تقسیم ہوتی ہیں۔ نہ یہ ایک عذاب ہے اور نہ دلکش سپنا۔ یہ تو ایک خلا ہے ایک وسیع خلا۔ جس میں بذاتِ خود زندگی کا نام و نشان تک نہیں۔ یہاں ہمارا دل نور کا منبع ہے۔ اسی کی جلا سے ہماری روح روشن ہے، اسی سے ہماری آنکھوں میں یہ ترو تازگی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ جب تک یہ شمع جلتی رہتی ہے ساری دنیا منوّر اور مسرور نظر آتی ہے، یہ چاند، سورج، ستارے سب ہماری اپنی روشنی سے نظر آتے ہیں۔ اور جس روز یہ شمع بجھ جائے تو چاروں طرف ظلمت ہی ظلمت چھا جاتی ہے اور کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ تب قدرت کا یہ کھیل کس قدر بے معنی اور بے رنگ و بو لگتا ہے۔ اور دل کے نور کے ساتھ روح کی جولانی اور آنکھوں کی شگفتگی بھی ختم ہو جاتی ہے۔

اور میرے دل کی شمع جسے محبّت کی شدید ناکامی نے ایک مرتبہ بجھا دیا تھا میں نے خود اُسے روشن کر لیا، اور اب وہ اتنی روشن ہے کہ خود میری آنکھیں خیرہ

ہوئی جاتی ہیں۔

میں مسکرانے لگا۔ لڑکپن میں کیسی کیسی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں؟ مجھے ثریا سے کس قدر محبّت تھی۔ میں اُسے کس قدر چاہتا تھا۔ بچپن سے اُسے پوجتا تھا۔ آج تک مجھے محض ایک مرتبہ محبت ہوئی تھی۔ فقط ثریا سے لیکن کتنی عجیب بات ہے کہ جب انتخاب کا وقت آیا تو ثریا نے اپنے پرانے رفیق کو چھوڑ کر احمد کو چن لیا۔ جو بالکل نووارد تھے۔ جن سے محض چند ہفتوں کی واقفیت تھی۔ جو نہ خوبصورت تھے اور نہ اُن میں کوئی خوبیاں تھیں۔ پتہ نہیں ثریا نے ایسا کیوں کیا تھا۔

اتنے قلیل عرصے میں وہ ثریا کو اتنے بھائے کہ وہ میری اتنی طویل رفاقت بھول گئی۔

محبت بھی کیسی عجیب چیز ہے؟ —— بالکل طوفان کی طرح ابھی تند و تیز ہے ابھی رخ پلٹا اور سکون ہی سکون ہے۔ جیسے کبھی کچھ تھا ہی نہیں۔ محبت کتنی غیر یقینی شئے ہے۔ جیسے ہوا کا رُخ ہو۔ نہ جانے کب بدل جائے۔

جس رات میں نے ثریا سے سب کچھ کہہ دیا تھا۔ اُس نے کتنی سنگدلی سے میری محبّت کو ٹھکرایا تھا۔ جیسے کسی بے وقوف بچے سے باتیں کر رہی ہو۔ مجھ سے دو تین سال بڑی ضرور تھی۔ لیکن یہ فرق برائے نام ہی تھا۔

اور مجھے کس قدر رنج ہوا تھا۔ جیسے کسی نے دل کچل دیا تھا۔ کتنے دنوں تک کھویا کھویا سا رہا۔ نہ دن کی خبر رہی نہ رات کی۔ اور آخر ناامید ہو کر کہیں باہر نکل گیا اور یہ تبدیلی میرے لئے کس قدر بہتر ثابت ہوئی۔ اگر میں کامیاب ہو جاتا اور ثریا مجھے چن لیتی تو اب تک شاید میں ایک گھریلو اور چڑچڑا شخص بن جاتا۔ جو شاید

زندگی کی یکسانیت سے تنگ آچکا ہوتا۔ ایک ہی جگہ رہ رہ کر، ایک ہی قسم کی باتیں سن سن کر کبھی کا بوڑھا ہو چکا ہوتا۔

لیکن اب میں کس قدر مختلف ہوں۔

اس طویل عرصے میں میں نے مصیبتوں پر قہقہے لگائے تھے۔ زندگی کی ظلمتوں میں، دل کو خون کر دینے والے حالات اور بھاری سے بھاری غموں میں میرا سر کبھی نہ جھکا۔ نہ ہی میں نے کبھی کسی کو اپنی مدد کے لئے پکارا۔ میں اپنے سفینے کا خود ہی ناخدا بن گیا۔

اور آٹھ سال پہلے میں ایک بے وقوف سا لڑکا تھا۔ زرد رو لڑکا جو ہر دم خواب دیکھا کرتا تھا جس کی زندگی ثریا کے قدموں میں نثار تھی۔ جس کا دل ثریا کی محبت میں تلملایا کرتا تھا جس کی آنکھوں میں ہمیشہ آنسو رہتے تھے۔ جو ہمیشہ ناممکن باتوں کے متعلق سوچا کرتا تھا ـــــ اگر یہ ہو جائے تو ـــــ اگر وہ ہو جائے تو ـــــ

میں ہنس پڑا ـــــ اب میں کتنا بدل گیا ہوں۔ اگر کہیں احمد مجھے مل جائیں۔ تو اُن کا شکریہ ادا کروں گا۔ اگر وہ نہ آتے تو نہ میں ٹھکرایا جاتا اور نہ یہ خوشگوار تبدیلیاں میری زندگی میں آتیں۔

توبہ توبہ! میں بھی کس قدر احمق رہ چکا ہوں۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، چار بجے تھے۔ کل علی الصبح چار بجے ـــــ پورے بارہ گھنٹے کے بعد میں گھر پہنچ جاؤں گا ـــــ عزیزوں سے ملاقات کس قدر خوشگوار ہو گی۔ اتنے طویل عرصے کے بعد۔ اور پھر اتنے عرصے تک میں نے انہیں کبھی بھی تو یاد نہ کیا تھا۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔

آج دسمبر کی اکتیس تاریخ ہے ـــــ کل نئے سال کا نیا دن طلوع ہو گا!
میں نے سگریٹ سلگائی اور کش لگانے لگا۔

اور ایک سٹیشن پر سچ مچ احمد مل گئے۔ پہلے تو مجھے یقین ہی نہ آیا۔ بڑی طرح سے چمٹ گئے اور مجھے ٹرین سے اتار لیا۔ بولے کچھ روز ٹھہرو۔ میں نے معذرت کی تو مجبور کرنے لگے۔ میری ایک نہ چلی۔ اور طے ہوا کہ کم از کم ایک رات تو ٹھہر جاؤں کل صبح کی ٹرین سے چلا جاؤں گا۔

میں نے انہیں غور سے دیکھا، کتنے تبدیل ہو گئے تھے؟ عینک لگ گئی تھی، چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ جسم ڈھیلا ہو گیا تھا، بوڑھے لگتے تھے۔ خوبصورت تو وہ پہلے بھی نہ تھے۔ لیکن اب تو بالکل یونہی سے لگتے تھے۔

"ثریا سے بھی مل لو گے" وہ بولے "بھلے آدمی صدیاں گزر گئیں۔ لیکن کچھ بھی تو پتہ نہ چلا تمہارا۔ رنج تو واقعی تمہیں بہت ہوا تھا۔ لیکن ایسا بھی کیا کہ زندگی سے بیزار ہو کر خانہ بدوشی شروع کر دیتے" اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

ذرا سی دیر میں ہم کار میں اُن کے گھر جا رہے تھے۔

"آخر کہاں رہے تم اتنے دنوں؟ ـــــ کبھی کبھار سن لیا کرتے تھے کہ آج یہاں ہو کل وہاں ہو۔"

ثریا ملی ـــــ بالکل ویسی ہی حسین، اُتنی ہی پیاری۔ اتنے طویل عرصے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ آنکھوں میں وہی فسوں تھا۔ لبوں پہ وہی مسکراہٹ اور پیشانی پر وہی نور۔

احمد بولے۔ "لو تم بھی دل ہی دل میں شاید کڑھا کرتی تھیں کہ ان صاحب کو اتنا رنج ہوا ہوگا۔ اتنا قلق ہوا ہوگا۔ یہ دیکھ لو۔ کیا مسکراہٹ چہرے پر کھیل رہی ہے قسم لے لو جو اتنا سا بھی رنج ہوا ہو۔"

ہم مسکرا رہے تھے۔ چاء کا دور چل رہا تھا۔ پرانی باتوں پر قہقہے لگ رہے تھے کتنی دیر ہم یونہی بیٹھے رہے۔ پھر احمد کو کہیں سے بلاوا آگیا اور وہ کچھ دیر کے لئے باہر چلے گئے۔

اب ثریا مسکرا کر بولی۔ "بیگم کہاں ہیں؟"

"کس کی بیگم؟" میں نے پوچھا۔

"تمہاری!"

"نہیں تو! — کوئی بیگم مل ہی نہ سکیں، مجھے اپنے ساتھ ہمدردی ہے۔" میں نے شوخی سے کہا۔

"کیوں شادی کیوں نہ کی تم نے؟" اُس نے پوچھا۔

"یونہی!"

"کس لئے آخر؟"

میں چپ رہا۔

میں نے فوراً باتوں کا رخ پلٹ دیا، اور اب سفر کی باتیں شروع کر دیں، طرح طرح کے لطیفے، چٹکلے، اور دلچسپ باتیں سنا رہا تھا۔ لیکن میں اکیلا ہی ہنس رہا تھا۔ اور ثریا ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی، اُس کے چہرے پر بیحد سنجیدگی تھی۔

"ایک بات پوچھوں، سچ بتاؤ گے کیا؟"

"ہاں ہاں!"

"پھر کبھی کوئی لڑکی اچھی لگی؟"

"نہیں!"

"جھوٹ!"

"سچ! خدا کی قسم، تمہاری قسم!" میں بولا۔

"کیوں؟"

"بس یونہی!"

× × × × × × × × × ×

وہ کھوئی کھوئی نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی

عجیب سی نگاہیں

خوابیدہ سی، حسرت بھری، غمناک نگاہیں۔ نہ جانے کتنی دیر اسی طرح گزر گئی۔ اور مجھے خبر نہ رہی کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔ بس میں دو پُرفسوں آنکھوں کے سامنے مسحور بیٹھا تھا ثریا باتیں کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ "کیا تمہیں اپنا بچپن یاد ہے؟ اپنا اور میرا۔ کیا تمہیں وہ پرانی رفاقت بھی یاد ہے؟ کیا تمہیں اُس ہرے بھرے باغ کا وہ خوبصورت گوشہ یاد ہے۔ جہاں وہ سرخ رنگ کے کمرے تھے ـــــ ہمارے کمرے۔ وہ کمرے کتنے پیارے تھے۔ دیواروں پہ رنگ برنگی تصویریں تھیں۔ چھت سے طرح طرح کے غبارے آویزاں تھے۔ اور میزوں پہ ہماری پریوں کی کہانیوں کی کتابیں، کھلونے اور رنگین لیمپ رکھے تھے۔ کیا تمہیں وہ سفید اُجلے پھولوں والا پودا بھی یاد ہے جو ایک دریچے میں سے اندر جھانکا کرتا تھا۔ اور بعض اوقات تو ہوا کے جھونکوں سے

اُس کی ٹہنیاں جھوم جھوم کر بالکل اندر آجایا کرتی تھیں۔ اُس کی ٹہنیوں میں کتنے پھول کھلتے تھے۔ اور جب رات کو چاند اُس دریچے کے پاس سے گذرتا تو اکثر اُسی پودے کی خار دار ٹہنیوں سے الجھ جاتا۔ اور دیر کے بعد نکلتا ــــ اور ہم کتنے پیارے بچے تھے؟ کیسے ہنس مکھ اور خوبصورت؟ ہم دونوں کی تصویریں اب تک رکھی ہیں، ہمیں ایک دوسرے سے کتنی محبت تھی؟ ــــ کبھی ایک دفعہ بھی تو نہیں لڑتے تھے۔ نہ کبھی کوئی رنجش ہوئی تھی۔ ہر وقت ہنستے رہتے تھے، ہمارے پڑوس میں رہنے والے بوڑھے انگریز اور ان کی بیوی کو تو تم نہیں بھولے ہوگے وہ ہم سے کس قدر محبت کرتے تھے۔ آس پاس کتنے سارے بچے رہتے تھے۔ لیکن انہیں صرف ہم ہی اچھے لگتے تھے۔ اور کیا تمہیں وہ بادل بھی یاد ہیں جو چپکے سے ہمارے کمروں میں چلے آتے تھے؟ جب اُجلے اُجلے بادل دوڑتے ہوئے سرو کے درختوں کے اوپر سے گذرنے لگتے تو ہم جلدی سے سب دریچے بند کر لیا کرتے لیکن بادل اندر آجاتے۔ اور دھواں ہی دھواں ہو جاتا ــــ کیا تمہیں وہ شہد کی مکھیاں بھی یاد ہیں جو پھولوں کے تختوں پر بھنبھنایا کرتی تھیں ــــ اور اونچے درختوں میں اُن کے بڑے بڑے چھتّے تھے۔ نوکر اکثر ہمیں شہد کے چھتے لا کر دیا کرتے تھے۔ وہ جھیل تو تمہیں نہ بھولی ہوگی۔ جو پرے پہاڑیوں میں تھی، کتنی منتوں کے بعد ہمیں وہاں کشتی کی سیر کی اجازت ملی تھی۔ ہماری انّا ساتھ گئی تھی، ذرا دیر پہلے بارش ہوئی تھی، ہوا کے خنک جھونکوں سے ہم ٹھٹھر رہے تھے۔ لیکن کشتی کی سیر کا شوق بے انتہا تھا، جھیل میں کیسی رنگ رنگ کی مچھلیاں تھیں، اور جب ہم جھیل کے وسط میں تھے تو یکایک ایک قوسِ قزح درختوں کے جھنڈ سے نکل آئی، اور آسمان

کوٹلے کرتی ہوئی پہاڑیوں پر چلی گئی۔ اور جھیل پر ایک رنگین پل بنا دیا۔ تمہیں وہ قوسِ قزح بھی یاد ہیں۔ جو بارش کے بعد ہمارے باغ کے اوپر آسمان میں نکلا کرتی تھیں، کتنے طرح طرح کے رنگ ہوا کرتے تھے۔ تم مجھ سے ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ ہم دونوں ایک دن کسی قوسِ قزح پر چلتے چلتے دور چلے جائیں گے۔ تاروں کی دنیا میں، جہاں پہنچکر شاید ہم دو مسکراتے ہوئے تارے بن جائیں گے۔ ایک مرتبہ ہم قوسِ قزح کے ایک سرے کی تلاش میں نکلے تھے۔ جو چنار کے درختوں کے اوپر تھا۔ لیکن اتنے ہیں بادل پھٹ گئے۔ سورج نکل آیا اور قوسِ قزح غائب ہوگئی۔ اب بھی بارش کے بعد اکثر قوسِ قزح نکلتی ہیں بالکل ویسی ہی —— اور کیا تمہیں وہ بوڑھی انّا بھی یاد ہے، وہی پُرشفقت انّا جس کا دل سونے کا تھا۔ جو ساری ساری رات ہمیں پریوں کی کہانیاں سنایا کرتی تھی، جب کبھی تمہاری امّی ڈانٹتیں، یا مجھے شرارتوں پر دھمکایا جاتا تو ہم رونی صورتیں بنا کر دریچوں میں بیٹھ جاتے تب ہمیں سب بزرگوں پر کیسا کیسا غصّہ آیا کرتا۔ اُس وقت ہماری محبوب انّا ہی ہماری غمخوار ہوتی تھی، وہی آکر ہمیں ہنساتی۔ گدگدیاں کرتی۔ کیا تم اُس کی لوریاں بھول گئے؟ وہ محبت بھری پیاری لوریاں، وہ چھوٹے چھوٹے گیت جو اُس کے سادے اور پُرخلوص دل سے نکلتے تھے۔ ہم غصّے میں آکر نہ جانے اُسے کیا کیا کہہ دیا کرتے، لیکن وہ کبھی بُرا نہ مانتی، اُس کا بھولا بھولا نورانی چہرہ ہمیشہ جگمگاتا رہتا۔ اب وہ دوسری دنیا میں ہے۔ مرتے وقت اُس نے تمہیں بہت یاد کیا۔ تمہیں دیکھنے کے لئے وہ بہت بے قرار رہی، بہت تڑپی، بار بار یہی پوچھتی رہی کہ تم کہاں ہو؟ تمہارا کوئی خط نہیں آیا؟ اور مرتے دم آخری لفظ جو اُس کے لبوں سے نکلا وہ تمہارا

نام تھا۔ کیا تمہیں وہ رنگین اور شوخ تتلیاں بھی یاد ہیں جو دریچوں سے اڑتی ہوئی کمرے میں آجاتی تھیں۔ ہمارے کمرے کے گرد بے شمار پھولوں کے پودے تھے۔ کئی پھولدار بیلیں تھیں۔ تمہیں وہ سیٹیاں بجانے والے پرندے تو نہ بھولے ہوں گے جن کے کئی پنجرے دالان میں آویزاں تھے۔ تم انہیں طرح طرح کی سُریلی سیٹیاں ہر روز سکھایا کرتے تھے۔ وہ دن کتنے اچھے تھے؟ اور ہم کیسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہو جایا کرتے تھے ____ اور وہ جنگل بھی تمہیں یاد ہو گا جو ہمارے باغ سے شروع ہو جاتا تھا۔ ہمیں نوکر وہاں لے جایا کرتے تھے، اور جب ہم پہلی مرتبہ وہاں گئے تھے تو کتنا ڈر لگا تھا۔ میں تو بالکل سہم گئی تھی۔ اور جب نوکر شہد کے چھتوں کی تلاش میں ہماری آنکھوں سے اوجھل گیا تو میں کتنی ڈری تھی، کانپتی ہوئی تم سے چمٹ گئی تھی۔ اب بھی میں اکثر وہاں جایا کرتی ہوں، وہاں سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا پہلے تھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا، ویسے ہی آسمان سے باتیں کرتے ہوئے شاہ بلوط کے درخت ہیں۔ وہی کانٹوں بھری جھاڑیاں ہیں۔ جن میں گلابی رنگ کے میٹھے میٹھے پھل لگتے ہیں، وہی پیچدار بیلیں ہیں جو پھولوں سے لد جاتی ہیں۔ وہی خود رَو جنگلی پھول ہیں جو گھاس سے سر نکال کر جھومتے ہیں۔ اور تمہیں وہ صنوبر کا درخت بھی یاد ہے جس کے تلے سبزے پر بیٹھ کر ہم پھل اور شہد کھایا کرتے تھے۔ وہ درخت جوں کا توں ہے، اُس کے نیچے اب بھی سبزہ لہلہاتا ہے۔ پھول مسکراتے ہیں اور جھینگر شور مچاتے ہیں۔"

اور یہ سب کچھ میری آنکھوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ شاید میں خواب دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں وہ چاندنی راتیں یاد ہیں۔ جب ہم دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے باغ میں

پھرا کرتے تھے۔ اُن دنوں میں کتنی ڈرا کرتی تھی۔ اب بھی میں ڈرا کرتی ہوں۔ رات کو کوئی آہٹ سنائی دے جائے تو سہم جاتی ہوں۔ اور کیا تمہیں وہ اون کی بلّی یاد ہے جو تم نے میری سالگرہ پر مجھے دی تھی۔ اب بھی وہ میرے پاس رکھی ہے۔ بالکل ویسی ہی چمکیلی ہے۔ فقط اُس کے گلے کا ربن کھویا گیا اور میں نے نیا باندھ دیا ہے۔ میں نے اُسے ایسی جگہ رکھا ہے۔ جہاں وہ ہر روز مجھے نظر آجاتی ہے.....''

وہ بدستور بول رہی تھی، اُس کے لب ہل رہے تھے اور میں اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اُسے دیکھ رہا تھا، جن میں وہی فسوں تھا، وہی گہرائی تھی، اور وہی معصومیت تھی۔

میرے سامنے وہی پیاری مورت بیٹھی تھی۔ وہی حسن کی دیوی، بلا کی حسین ثریّا میرے بچپن اور لڑکپن کی رفیق۔ وہی بھولی بھالی لڑکی، جس کی بہکی بہکی نگاہیں، کھوئی کھوئی باتیں مجھے جان سے زیادہ عزیز تھیں۔

میں نے اُن ہلتے ہوئے سرخ ہونٹوں کو دیکھا، یہ وہی ہونٹ تو ہیں جنہیں میں نے بارہا چوما تھا۔ یہ وہی گلابی رخسار ہیں، وہی سنہری لٹیں ہیں، وہی دلکش پلکیں ہیں۔ یہ وہی نازک بازو ہیں جو میرے گلے میں حمائل رہا کرتے تھے اور یہ وہی حسین و جمیل چہرہ ہے۔ جو میرے سینے سے لگ کر سرگوشیوں میں پیار بھری باتیں کیا کرتا تھا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ مجھے سب کچھ یاد ہے، ایک ایک بات یاد ہے، میں کچھ بھی تو نہیں بھولا مجھے وہ بچپن یاد ہے جو ہم نے اکٹھے گذارا تھا۔ مجھے تمہاری طویل رفاقت یاد ہے تم واقعی نہایت ہی خوبصورت بچی تھیں اور اب بھی تم اتنی ہی حسین ہو، اتنی ہی پیاری ہو۔ مجھے وہ رنگ برنگے پھول اور ناچتی ہوئی تتلیاں

بھی یاد ہیں۔ وہ جگمگاتے ہوئے لمحے بھی یاد ہیں۔ جو ہم نے اکٹھے گذارے تھے، وہ ہرا بھرا باغ، وہ گھنا جنگل، شاہ بلوط کے دیو قامت درخت جھلمل جھلمل کرتی ہوئی خوابیدہ جھیل، خوشنما قوس قزح وہ صنوبر کا تنہا درخت ـــــ سب کے سب میری آنکھوں کے سامنے پھر رہے ہیں، میں اُس نورانی چہرے والی مشفق انا کو بھی نہیں بھولا۔ خدا اُس کی لحد پر اپنی رحمتوں کی بارش کرے، اگرچہ میں اُسے اب کبھی نہیں دیکھ سکتا، لیکن اُس کے پرشفقت ہاتھ کا لمس اب بھی محسوس کرتا ہوں اور مجھے محبت کی وہ تند و تیز آگ بھی یاد ہے۔ جس میں میں پھنکا کرتا تھا۔ تمہاری محبت کی آگ۔ اب بھی میں یہی سوچتا ہوں کہ وہ محض محبت ہی نہیں تھی۔ بلکہ کوئی اور جذبہ تھا محبت سے بھی معصوم اور بلند تر۔ اور تمہارا جس قدر احترام میرے دل میں پہلے تھا۔ اتنا ہی اب بھی ہے۔ مجھے تمہاری محبت بالکل نہیں بھولی۔ وہ محبت جو لمحہ بڑھتی گئی اور مجھے اپنی پہلی اور تلخ ترین شکست بھی یاد ہے۔ وہ دن بھی یاد ہے۔ جب وہی سہمی ہوئی معصوم محبت کا جنازہ نکلا تھا۔ میری آرزوئیں، امنگیں، سب دفن ہو گئی تھیں۔ اُس دن کے بعد میں نے کبھی محبت کے متعلق سوچا بھی نہیں۔ کتنی التجاؤں کو ٹھکرا دیا۔ کتنی پیار بھری نگاہوں کو مایوس کر دیا۔ محبت سے میرا عقیدہ اُٹھ گیا۔

لیکن ثریا اب غمگین کیوں ہے؟ سب کچھ اس کی خواہش کے مطابق ہوا۔ اب اس کی آنکھوں میں آنسو کیوں لرز رہے ہیں؟ یہ بیتے ہوئے دنوں کی باتیں کیوں کر رہی ہے؟ اُسے وہ سہانا زمانہ کیوں یاد آرہا ہے؟ یہ اپنی موجودہ زندگی کی مسرتوں کی باتیں کیوں نہیں کرتی؟ یہ احمد کے متعلق باتیں کیوں نہیں کرتی؟ شاید اُسے یہ زندگی پسند نہیں، شاید اس کا انتخاب غلط نکلا، شاید اُسے احمد میں وہ ہنسی

نہ مل سکی جس کے لیے اس نے میری محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ شاید اس کے دل میں میری پہلی محبت جوں کی توں محفوظ ہے، شاید یہ میرے چہرے میں اُسی بھولے بھالے پیارے چہرے کو دیکھ رہی ہے۔ جو اتنے دنوں اُس کا دوست رہا تھا۔

وہ بدستور ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی، اُس کی نگاہیں غمگین ہوتی گئیں۔ اُس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ بڑھتی گئی، ایک مرتبہ تو اُس نے اپنی پلکوں پر اٹکے ہوئے دو موٹے موٹے آنسو پونچھ ڈالے، ملگجے دوپٹے کی روپہلی گوٹ میں اُس کا چہرہ کتنا پیارا لگ رہا تھا۔ چاندنی میں وہ دنیا کی حسین ترین مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ اتنے میں دو بچے آ گئے۔ ایک پگلا سا لڑکا اور ایک موٹی موٹی آنکھوں والی خوبصورت بچی۔

"یہ کون ہیں؟"

"پڑوس میں رہتے ہیں، دونوں کی بڑی گہری دوستی ہے، ہمیشہ اکٹھے رہتے ہیں۔"

میں نے انہیں پاس بلا کر گود میں بٹھا لیا اور پیار کرنے لگا۔ ثریا بچے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ "اس کا نام تو کچھ اور تھا۔ لیکن میں نے اس کی امی کو مجبور کر کے بدل دیا، اور اب اس کا نام تمہارے نام پر رکھا ہے۔ بالکل تم سا ہے، نہ جانے ہر وقت کیا سوچتا رہتا ہے کچھ خواب سے دیکھتا رہتا ہے، بات بات پر اداس ہو جاتا ہے، تنہائی میں آنسو بہانے بیٹھ جاتا ہے، نہ جانے کس دنیا میں رہتا ہے۔ اس بچی سے اسے اتنی محبت ہے کہ اس کے بغیر ایک لمحہ چین نہیں پڑتا۔"

میں نے بچے کی آنکھوں کو دیکھا، اور ایک طویل داستان میرے سامنے پھرنے لگی۔ بچپن کی معصوم رفاقت، لڑکپن کی سہمی ہوئی محبت —— اور پھر جوانی کی آگ

کیا ہمیشہ ایک ہی قصہ بار بار دہرایا جاتا ہے۔ کیا محبت کے پھیکے خواب شروع شروع میں ایسے ہی رنگین ہوتے ہیں۔ قدرت کو اس خونخوار کھیل میں کیا لطف آتا ہے خدا نہ کرے کہ یہ بچہ جو مجھ جیسا ہے۔ میری ہی طرح اجڑ جائے! خدا نہ کرے کہ اس کی زندگی میں بھی ایسی تلخ گھڑیاں آئیں۔

احمد آگئے، اور پھر ویسی ہی باتیں شروع ہو گئیں۔ وقت گزرتا گیا۔ اور کافی رات گئے میں سب کو شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں گیا۔ طبیعت میں الجھن سی تھی، نہیں! یہ محض الجھن ہی نہیں تھی۔ جلن تھی۔ آنکھیں پُرنم ہوتی جاتی تھیں۔ دل بیٹھا جارہا تھا میں دریچے کے پاس کھڑا ہو کر باہر دیکھنے لگا۔ نہایت ہی سہانی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ آسمان سے نور برس رہا تھا۔ پھول، پتے، ٹہنیاں سب پر ایک روپہلی ملمع چڑھا ہوا تھا۔ چاندنی میں ہر ایک چیز کیسی عجیب لگتی ہے۔ اور یہ سائے کیسی پراسرار مخلوق ہیں، یوں لگتا ہے جیسے ان میں بھی جان ہے، یہ تھرکتے بھی ہیں اور گھٹتے بڑھتے بھی رہتے ہیں۔

نہ جانے کیوں میں کمرے سے باہر نکل آیا اور چپکے سے باغ میں چلا گیا، چاند اتنی تیزی سے چمک رہا تھا کہ آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ میں باغ میں پھرتا پھرتا ایک سرو کے پاس بیٹھ گیا۔ اب میں چاند کو پتلی پتلی ٹہنیوں کے پیچھے سے جھانکتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

میرا دل تلملا اٹھا، ایک سیلاب آیا اور سب کچھ بہا کر لے گیا۔ ایک طوفان نے سب کچھ زیر و زبر کر دیا۔ اور میری آنکھوں کے سامنے آج سے آٹھ سال پہلے

کی ایک بات پھرنے لگی۔

میرے خدا! ایسی ہی تو حسین رات تھی۔ یہی چاند تو مسکرا رہا تھا، یہ نورانی آسمان محیط کئے ہوئے تھا۔ یہی ننھے منے تارے ٹمٹما رہے تھے۔ بالکل ایسی ہی رات تھی۔ جب میں نے ثریا سے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس محبت کا اظہار جو مجھے ہمیشہ سے تھی۔ ازل سے تھی۔

میں نے اس کا بازو اپنے ہاتھ میں لے کر کہا تھا ــــ "میں جانتا ہوں یہ سب خواب ہے۔ جبھی تو تم اتنی حسین معلوم ہو رہی ہو۔ یہ ملکوتی حسن، یہ دلآویز تبسّم، یہ فسوں، یہ اس دنیا سے ہرگز تعلق نہیں رکھتے۔ جلدی کرو۔ چاند غروب ہونے والا ہے درختوں کے سائے لمبے ہو جائیں گے اور اس جھنڈ کے پیچھے چاند چھپ جائیگا، اور یہ پھول کلیاں اور پتے سب سو جائیں گے، یہ جھینگر جو گا رہے ہیں، اس درخت کے سائے میں جہاں کرنیں چھن رہی ہیں۔ وہ پرندہ تم نے دیکھا جو اڑا جا رہا ہے ــــ وہ راستہ ہے ہمارا۔ آج ہم کرنوں پر چلتے جائیں گے۔ حتےٰ کہ کسی ایسے طلسم زدہ مقام پر پہنچ جائیں گے۔ جہاں ہم دو مسکراتے ہوئے پھول بن جائیں گے ایک ہی ٹہنی کے دو حسین پھول، ایک دوسرے کو چومتے ہوئے پھول، جنہیں شبنم چمکا دیگی نسیم سحری جھولا جھلائے گی، اور جن کی خوشبو سے گلشن مہک اٹھے گا ــــ یہ روپہلی روشنی جو پتوں پر ناچ رہی ہے یہ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے تارے۔ یہ ہوا کے سرگوشیاں کرتے ہوئے جھونکے ــــ یہ زندگی کا پُر اسرار طلسم، یہ صبح شام کی رنگینیاں ــــ یہ سب تمہاری محبت کے کرشمے ہیں، تمہارے جگمگاتے ہوئے پیارے چہرے کو دیکھ کر

میری آنکھوں میں نور آجاتا ہے۔"

وہ مسکرائی اور ساری کائنات مسکرانے لگی۔ ہم ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے جس کی چوٹی ستاروں تک پہنچتی تھی، پھر میں نے اُسے اپنے خواب سنائے، اور جیسے اپنی ساری زندگی اُسے سونپ دی، اپنا معصوم بچپن، بے وقوف سا دل، گھبرائی ہوئی روح، سہمی ہوئی محبت۔ سب کچھ اُس کے قدموں میں رکھ دیا۔

میں نے اُس کا نازک سا ہاتھ اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور بولا "تم قدرت کی حسین ترین چیزوں سے بھی زیادہ حسین ہو۔ مجھے ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں تمہاری پیاری باتیں سنائی دیتی ہیں۔ میں بہتی ہوئی ندی کے شور میں تمہارے قہقہے سنتا ہوں، طلوع ہوتے ہوئے سورج میں تمہارا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آتا ہے، چاند میں، تاروں میں، کھلکھلاتے ہوئے پھولوں میں شرماتی ہوئی کلیوں میں — ہر جگہ تم ہی تم ہو، تم میری دنیا پر چھا گئی ہو۔ میری آنکھوں میں بس گئی ہو۔ میری روح میں سما گئی ہو،

اگر تم میری ہو جاؤ تو میری زندگی بدل جائے۔ میری دنیا بدل جائے۔ میرے صبح شام بدل جائیں اور میری زندگی میں اتنی مسرتیں چلی آئیں جتنی شاید بہشت میں بھی نہ ہوں گی۔ اس کے بعد میں کوئی مزید مسرت خدا سے نہ مانگوں گا۔ میں اپنا پر خلوص دل تمہارے قدموں میں رکھ دوں گا، ایسا دل جس میں تم ہی تم ہو گی میں ان آنکھوں کی، ان پلکوں کی، ان لٹوں کی پرستش کیا کروں گا۔ اور اس جگمگاتے ہوئے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھا کروں گا۔ جب تک کہ میری آنکھوں میں نور ہے — تم ہی میری آنکھوں میں بسو گی۔"

لیکن اُسے یہ سب کچھ اچھا نہ لگا۔ میری التجائیں بے کار ثابت ہوئیں۔ اس کے دل پر کچھ بھی اثر نہ ہؤا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے یاد رکھے گی۔ شاید کبھی کبھار میں اس کے خوابوں میں بھی آجاؤں۔ لیکن اُس نے یہ صاف صاف بتادیا کہ ہماری راہیں مختلف ہیں۔

وہ بولی ”تم عمر میں چھوٹے ہو، ناسمجھ ہو تمہاری طبیعت میں بچپنا ہے، کاش تم سمجھ سکتے کہ دنیا میں زیادہ آرزوئیں ایسی ہیں جو نابود ہوجاتی ہیں، زیادہ امیدیں ایسی ہیں جو جوزندہ دفن ہوجاتی ہیں۔ زیادہ خواب ایسے ہیں جو کچلے جاتے ہیں۔ اور اکثر دل ٹوٹ جایا کرتے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے کئی لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کبھی ایک دوسرے کے رفیق نہیں بن سکتے۔ مجھے افسوس ہے، بہت افسوس ہے، کیونکہ میں جانتی ہوں کہ تم اب جاکر روؤ گے۔ اور اس رات کو دیر تک نہیں بھولو گے، لیکن میں مجبور ہوں۔ مجھے بہت ہی افسوس ہے تم سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن تم نے ایک مصیبت میرے گلے ڈال دی ہے، اب تم مجھے یاد آیا کرو گے، مجھے تم پر کتنا ترس آیا ہے۔ شاید تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ میں تمہیں کبھی نہ بھول سکوں گی۔ اور یہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی۔“

”لیکن کیوں؟ کیا میں اس قابل نہیں؟“

”نہیں نہیں! یہ بات نہیں، اب احمد آگئے ہیں، ان کے آنے سے پہلے اگر تم نے یہ سب کچھ کہا ہوتا تو شاید —— لیکن نہیں۔ اب یہ سب فضول ہے۔ اب احمد آگئے ہیں۔ میں تمہیں بُرا تو نہیں کہتی —— تم اچھے ہو۔ لیکن احمد بہت اچھے ہیں۔ بہت ہی اچھے ہیں۔“

اور جب وہ چلی گئی تو مجھے یوں محسوس ہوًا جیسے میرے دل کی دھڑکن ہمیشہ کیلئے بند ہوگئی۔ میری روح کا طوفان اور وقت کا شور ختم ہو گیا۔

اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوًا۔ میرے صبح و شام کیونکر گزرتے تھے۔ مجھے کچھ بھی تو یاد نہیں۔ میں سارا سارا دن تاریک گوشوں میں چھپا رہتا۔ کبھی کبھار شام کو باہر نکلتا روشنی سے گھبراتا ہوًا۔ انسانوں سے ڈرتا ہوًا۔

میں چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ کسی سے نہ بولتا۔ ایک ایک کرکے میں نے تمام دوست کھو دیئے۔ اب میرا دل بالکل خالی تھا۔ یہاں تک کہ جو رشک یا حسد میرے دل میں احمد کے لئے تھا وہ بھی نہ رہا تھا۔

مجھے ڈھونڈا جاتا۔ کمروں میں تلاش کیا جاتا۔ اور میں ہمیشہ کسی تاریک کمرے میں تنہا ملتا۔

اسی طرح دن گذرتے گئے اور وہ غم جو میرے دل پر مسلّط تھا آہستہ آہستہ میری روح پر چھا گیا۔ اور زندہ رہنا دوبھر ہوگیا۔ زندگی محال ہوگئی۔ دنیا سے جی بھر گیا ایک روز میں نہ جانے کیا سوچ کر دور نکل گیا اور ایک اونچے پہاڑ پر چڑھ گیا۔ ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر کچھ سوچنے لگا، نیچے ایک برساتی ندی شور مچاتی ہوئی بہ رہی تھی۔ چاروں طرف چٹانیں ہی چٹانیں تھیں۔ میں کافی بلندی پر تھا ــــ میں نے نیچے چٹانوں کی طرف دیکھا۔ نکیلے پتھروں کو دیکھا۔ اُس شور مچاتی ہوئی ندی کو دیکھا۔ اور مجھ پر ایک عجیب سی وحشت طاری ہوگئی۔

عین اُسی وقت مجھے ایک آواز نے چونکا دیا۔ میں نے گھبرا کر دیکھا۔ ایک دراز قد شخص میرے پاس کھڑا مجھے شام بخیر کہہ رہا تھا۔ اُس کے دمکتے ہوئے چہرے پر تازگی

بھی مسکراہٹ تھی۔ اُس نے نہایت ہی شوخ رنگ کا لباس پہن رکھا تھا۔

ہم چند لمحے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ بیحد مسرور تھا۔ اُس نے سگریٹ پیش کی۔ جسے میں نے بڑی بے دلی سے قبول کیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔

"کتنی دلفریب شام ہے۔" وہ بولا۔ "چمکتا ہوا نیلا آسمان، خودرو پھولوں کے تختے اور ہوا کے خنک جھونکے، اگر مجھے ایسی فضا ہر روز میسر آجائے تو میں خدا سے اور کچھ نہ مانگوں۔"

میں چپ بیٹھا تھا۔

"آج اتفاق سے میں اُس ندی میں مچھلی کا شکار کھیلنے چلا آیا۔ دوپہر سے گول گول پتھروں میں بیٹھا رہا ہوں۔ آپ کو اس قدر بلندی پر تنہا دیکھا تو چلا آیا۔ آپ شاید غروبِ آفتاب دیکھنے اتنی بلندی پر آئے ہوں گے۔"

"جی نہیں ویسے ہی آگیا تھا۔"

"آج مجھے ایک بھی مچھلی نہیں ملی، البتہ چند تتلیاں میرے رنگین مفلر کو پھولوں کا گلدستہ سمجھ کر آگئی تھیں۔ چاہتا تو انہیں پکڑ لیتا۔ لیکن پھر سوچا اس خوشنما دنیا میں سیر کرنے کا جتنا حق مجھے ہے، اتنا ہی ان رنگین تتلیوں کو بھی ہے۔ زندگی کتنی پیاری چیز ہے۔ بھلا اس رنگ و بُو کے طوفان کو چھوڑ کر کون جانا پسند کریگا؟"

"اور اگر روح رنج والم کے بوجھ سے دب جائے تو؟"

"تو یہ چمکیلا چاند ہے، یہ مسکراتے ہوئے تارے ہیں، یہ جگمگاتے ہوئے پھول ہیں۔ قدرت ایک مشفق محبوب کی طرح دلداری کرتی ہے اور بہت کچھ بھلا دیتی ہے۔"

"اور اگر آنکھیں بے نور ہو جائیں ——— ؟"

"تو پرندوں کے سُریلے چہچہے ہیں، سرگوشیاں کرتے ہوئے ہوا کے جھونکے ہیں۔"

"اور اگر محبت کی ناکامی دل میں نشتر چبھونے لگے تب؟"

"محبّت کی ناکامی کوئی ناکامی نہیں۔ محبت جوانی کی خزاں ہے۔ محبت روح کو گھن لگا دیتی ہے۔ دنیا کی نصف سے زیادہ آہیں، رنج اور مصیبتیں محض محبت کی وجہ سے ہیں۔ مسرّتوں سے کہیں زیادہ یہ ہمیں ہمیشہ رہنے والا رنج بخشتی ہے۔ یہ ایک ایسا سودا ہے۔ جس میں نفع کم ہے اور نقصان بہت زیادہ۔ میں آج تک کبھی غمگین نہیں ہوا۔ میں نے محبت بھی کی ہے۔ لیکن میری مسرّتوں کی اتنی قسمیں ہیں اور میرے دل پر خوشی کی جلا اس قدر ہے کہ محبّت کی اہمیت بالکل ذرا سی رہ گئی ہے۔"

"لیکن سدا کے غمزدہ دل پر کسی خوشی کا اثر نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"یہ دنیا کتنی وسیع ہے۔ یہاں محبّت کے سوا اور بھی بے شمار خوشیاں ہیں۔ اس سے بھی معصوم اور بلند تر۔ کئی ایسی بھی ہیں جو محبت کے گہرے سے گہرے زخم کو مندمل کر دیتی ہیں۔ میری زندگی میں بھی ایسے لمحات آئے، جب میں چاہتا تو روگ لگا لیتا اور پھر ساری عمر نہ مسکراتا۔ لیکن نہیں! جہاں زندگی خدا کا تحفہ ہے وہاں مسرور رہنا انسان کا فرض ہے۔ مسکراتے ہوئے وقت گذارنا خدا کی بہترین عبادت ہے۔"

اُس نے میری ناک پر رکھی ہوئی کالے شیشوں کی عینک اُتار دی اور بولا۔ "یہ سیاہ عینک ہے۔ جس سے تمہیں ہر ایک چیز تاریک نظر آ رہی ہے۔ ذرا اب دنیا کو دیکھو یہ غروبِ آفتاب کتنا دلفریب ہے۔ یہ ماحول کس قدر روشن اور چمکیلا ہے۔"

اور واقعی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

میں بیٹھا سورج کی سنہری شعاعوں کو دیکھتا رہا۔ شفق پھولی اور سورج غروب ہو گیا۔

"اور اُدھر دیکھو۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ چودھویں کا چاند جگمگا رہا تھا۔ میرے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ چاند اتنی تیزی سے چمک رہا تھا۔ جیسے اُس کی کرنیں میرے سینے سے ہوتی ہوئیں میرے دل کو منوّر کر رہی تھیں۔

ہم دونوں پگڈنڈی سے نیچے اُتر رہے تھے۔

جب ہم جدا ہونے لگے تو وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "تم یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ اس زندگی، اس ماحول اور اس پرانی فضا کو یہیں چھوڑ کر ایک نئی زندگی کی تلاش میں نکل جاؤ۔ دیکھ لینا تھوڑے ہی دنوں میں تم ان غمگین لمحات پر اور اپنی اس حالت پر ہنسا کرو گے۔ جب میں تمہیں یاد آؤں تو بس مسکرا دیا کرنا۔"

اور میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ایک نئی زندگی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ شاید سال کی آخری تاریخیں تھیں۔ جب میں نے وہ حدود طے کیں۔ اور جب نئے سال کا پہلا سورج طلوع ہوا تو میں نئی حدود میں۔ اُس پُراسرار اجنبی کی گفتگو نے مجھ میں نئی روح پھونک دی تھی۔ ایک طویل مسافت کے بعد میں کہیں دور جا نکلا بالکل اجنبی جگہ میں۔

لیکن یہ سب کچھ بھولنے میں مجھے کچھ دیر لگی۔ آخر وقت نے ان زخموں پر مرہم لگا دیا اور ماضی دھندلا ہوتا گیا اور پھر ایک دن میں نے ماضی کو دفن کر دیا۔

اب میں ایک نئی دنیا میں تھا۔ نئی زندگی تھی، یہ سب کچھ نیا تھا۔

اور اب ـــــ اب بھی شاید ویسا ہی ہوں ـــــ لیکن کیا میں سچ مچ پتھر جیسے دل کا مالک ہوں؟ ـــــ کیا واقعی میری روح مسرور اور مطمئن تھی؟ کیا واقعی میں ثریا کو بھول چکا ہوں، اپنے ماضی کو دفن کر چکا ہوں؟ ـــــ کہیں میں اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دے رہا؟ کہیں میں اتنے سال اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دیتا رہا ہوں؟

کتنی عجیب بات ہے کہ میں خود اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکتا، اب تک نہیں سمجھ سکا۔ یہ زندگی کتنی عجیب ہے اور انسان کا دل بھی کتنی عجیب چیز ہے جس کے ایک گوشے میں آگ لگی رہتی ہے اور دوسرے کو خبر تک نہیں ہوتی! ایک حصہ درد و کرب سے تڑپتا رہتا ہے اور دوسرا مسرت سے مچلتا رہتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو کتنی آسانی سے بہلا پھسلا لیتے ہیں، کیسی عیاری سے دھوکہ دیتے ہیں!

اور اب میرے پاس سب کچھ ہے۔ صرف ایک کمی ہے مسرت کی۔ یوں ظاہرا طور پر تو بیحد مسرور رہا ہوں، دوسرے بھی میری صحبت میں بہت مسرور رہے ہیں لیکن میرا دل غمگین ہے۔

اور اب تک میں مسرت کی تلاش میں ہی رہا ہوں۔ دل کے زخم کے لئے مرہم ڈھونڈتا پھرا ہوں۔ میں نے لق و دق صحراؤں میں، تاریک اور سنسان جنگلوں میں مسرت کو ڈھونڈا۔ میں نے نامعلوم ویرانوں میں، اجاڑ کھنڈروں میں، آباد محفلوں میں اسے ڈھونڈا، میں نے غمزدہ روحوں کی صحبت میں بے کس ہستیوں کی دلجوئی میں مسکراتی ہوئی مخلوق کے قرب میں دمکتے ہوئے چہروں میں، آسمانی نغموں میں اس کی تلاش کی۔ لیکن اُسے کبھی نہ پا سکا۔

اور دراصل میری مسرت صرف ایک جگہ تھی۔ دنیا بھر کی وسعت میں صرف ایک مرکز پر محدود تھی —— ثریا کی رفاقت میں۔

اس مسرت سے میں محروم تھا محروم رہا تھا، البتہ یہ ضرور ہوا کہ دل کی جس دہکتی ہوئی آگ کو میں لے کر نکلا تھا۔ وہ مدھم پڑ گئی، تپش کچھ کم ہو گئی، دیکھنے میں یہ آتشکدہ راکھ کا ایک ڈھیر بن گیا۔ کچھ لمحے ایسے بھی آئے جب میں اُسے بھول بھی گیا۔ لیکن چند چنگاریاں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں۔ اب دفعتہً بھڑک اُٹھیں۔ دل کے شکستہ شیشے کو ذرا سی ٹھیس پہنچی اور وہ بالکل ہی چور چور ہو گیا۔ میں اتنے دنوں مسکراتا بھی رہا تھا لیکن میرے قہقہے مصنوعی تھے۔ وہ مسکراہٹیں کھوکھلی تھیں۔

اپنے دل پر جو مصنوعی مسرت کا ہلکا سا خول میں نے چڑھایا تھا۔ وہ بالکل کمزور تھا، یہ نئی امیدیں پانی کا بلبلہ تھیں، ابھی تھا۔ ابھی گیا۔ میں نے جو نئی دنیا اپنے لئے تخلیق کی تھی وہ ناپائدار تھی۔ وہ خواب کی دنیا تھی۔ میں اتنے دنوں ایک خواب دیکھتا رہا اور جب میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ میری روح پر وہی عذاب طاری ہے، میں اُسی آگ میں پھنک رہا ہوں۔ میری آنکھوں میں وہی آنسو ہیں جو ایک مرتبہ میں نے خشک کر لئے تھے۔ اور میں وہی بے وقوف سالڑکا ہوں جو ثریا کی محبت میں کھویا کھویا رہتا تھا۔ جسے نہ دنیا سے دلچسپی تھی۔ نہ دنیا کی دلفریبیوں سے جس کا دل ثریا کی بات بات پر نثار تھا، ثریا ہی اُس کی آرزو تھی، وہی اُس کی جستجو تھی۔ میں وہی تو ہوں، وہی پاگل سالڑکا جو ہر وقت خواب دیکھتا رہتا تھا۔ مجھے سب کچھ یاد ہے، ساری تصویریں میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہیں، مجھے ثریا سے اتنی

ہی محبت ہے جتنی پہلے تھی بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ یہ میری زندگی کی پہلی اور آخری محبت ہے
میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ کوئی چیز میرا دل مسوس رہی تھی چٹکیاں لے رہی تھی۔ میری
روح تلملا رہی تھی۔ میں نے آستین سے آنسو پونچھ ڈالے۔ میں نے اس طویل عرصے میں
ایک بھی آنسو نہ بہایا تھا۔ لیکن اے میرے خدا! بالکل ایسی ہی رات تو تھی یہی چاند چمک
رہا تھا۔ یہی ننھے منے تارے ٹمٹما رہے تھے۔ یہی سناٹا تھا۔ ایسے ہی درخت کے نیچے
میں نے ثریا کے قدموں میں اپنی محبت رکھ دی تھی جسے اُس نے ٹھکرا دیا تھا۔

میں نے چاروں طرف دیکھا کہ کوئی مجھے دیکھ تو نہیں رہا پھر میرا سر جھک گیا انتہائی
بیکسی سے میں ایک زخم خوردہ روح کی طرح گر پڑا۔ اور میری آنکھوں سے آنسوؤں کی دھارا بہہ نکلی

یوں معلوم ہوتا تھا کہ ایک زبردست جوالا مکھی جو عرصے سے خاموش تھا جاگ اُٹھا ہے۔

میں سسکیاں لے لے کر بچوں کی طرح رو رہا تھا، اپنی محبت کی زندہ لاش پر، اپنی شکست
پر، اپنی زندگی پر، اپنی تنہائی پر۔

پتے پتے پر چاندنی کھیل رہی تھی۔ کلیاں، پھول، پتے سب سوئے پڑے تھے۔ درختوں
کے سائے لمبے ہوتے جا رہے تھے، چاند آہستہ آہستہ درختوں کے جھنڈ میں چھپا جا رہا تھا۔
ٹہنیوں سے چاند کی کرنیں چھن رہی تھیں، دور کہیں ایک بلبل اپنے محبوب سے شکوہ کر رہی
تھی اور ایک بدنصیب غمزدہ دل اپنی زندگی کا مرثیہ پڑھ رہا تھا۔

جب میرے آنسو تھمے تو چاند غروب ہو چکا تھا۔ مشرق میں تیز روشنی ہو رہی تھی۔
ستاروں کی شمعیں ایک ایک کر کے بجھتی جا رہی تھیں۔

اور جب میں لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اپنے کمرے کی طرف چلا جا رہا تھا تو سر وکے

درختوں میں مجھے ثریا ملی جو بیحد غمگین تھی۔ اُس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اُس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ سرخ ہو رہی تھیں۔ جیسے دیر تک روتی رہی ہوں۔ میں نے جلدی سے ایک آنسو پونچھا جو میرے رخسار پر پھسل رہا تھا۔ جب ہم ایک دوسرے کے قریب سے گذرے تو میں نے صبح بخیر کہا اور اُس نے ایک پھیکی مسکراہٹ سے جواب دیا۔

ذرا سی دیر کے بعد میں ٹرین میں تھا، احمد مجھے ٹرین پر چھوڑنے آئے تھے۔
دفعتاً مجھے خیال آیا کہ آج نئے سال کی پہلی صبح ہے۔ آج لوگوں کے دل میں کیسی کیسی امنگیں ہوں گی۔ لوگ مسرتوں کے لئے دعا مانگ رہے ہونگے۔ اور ایک میں ہوں جس کے لئے یہ چمکیلا دن ایک اداس سی شام سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا پھر میں سوچنے لگا کہ میں اب کہاں جا رہا ہوں؟ —— مجھے کہاں جانا چاہیئے؟ —
میری منزل کہاں ہے؟
کیا میں لوٹ کر پھر یہاں سے بہت دور چلا جاؤں، اس مرتبہ اتنی دور کہ پھر کبھی واپس نہ آسکوں۔
لیکن نہیں —— اب اس کا کوئی فائدہ نہیں، اب شاید میں اپنے آپ کو دھوکا دینے میں کامیاب نہ ہو سکوں گا۔
میں نے ملّاحوں سے سنا تھا کہ انہیں سمندر کی تنہائی میں رات کی تاریکیوں میں پر اسرار آوازیں سنائی دیا کرتی ہیں۔ تاریکیوں سے کوئی اُن کا نام لے لے کر پکارتا ہے۔
مجھے کئی سیاحوں نے بتایا تھا کہ گھنے جنگلوں اور ویران صحراؤں میں رات کو سفر

کرتے وقت کتنی ہی مرتبہ انہوں نے کسی نامعلوم ہستی کو ان کا نام لے لے کر چلاتے سنا تھا۔
اب میں زندگی کے ان کھنڈروں اور اجاڑ ویرانوں میں سے کسی کو اپنا نام پکارتے ہوئے صاف سن رہا تھا۔

تاریک مستقبل مجھے پکار رہا تھا۔ تنہائی مجھے پکار رہی تھی۔ میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا سنہری دھوپ، لہلہاتا ہوا سبزہ، پیلے پیلے کھیت، درختوں کی قطاریں، پھوار اڑاتی ہوئی ندیاں اور اوپر نیلا نیلا چمکتا ہوا آسمان، رنگ برنگے پرندے تیرتے اور غوطے لگاتے ہوئے!

پہلے یہی چیزیں مجھے کتنی عزیز تھیں، قدرت مجھے کتنی عزیز تھی۔ اور اب میرے لئے نہ سورج میں ضیا ہے، نہ چاند تاروں میں روشنی۔ یہ پھول، یہ گلشن۔ یہ دنیا —— سب بے معنی سی چیزیں ہیں۔

آج میں اپنے آپ کو کس قدر تنہا محسوس کر رہا ہوں، اور جوں جوں عمر گذرتی جائیگی یہ احساسِ تنہائی بڑھتا جائیگا۔ حتےٰ کہ مجھے گھیر لے گا۔ تب نہ جانے میرے صبح و شام کیونکر گزریں گے؟ اور جب یہ آنکھوں کا نور اور دل کی جولانیاں جواب دینے لگیں گی تب میرا رفیق کون ہوگا؟

میرے رخساروں پر آنسو بہنے لگے۔

یہ زندگی کتنی عجیب ہے۔

ابھی پرسوں ہی کس قدر مختلف تھا۔ میرے دل میں امنگیں تھیں، زندگی کی تمام خوشیاں مجھ پر مسکراتی تھیں، میرے دل میں زندہ رہنے کی خواہش تھی، بلند عزائم تھے، آہنی حوصلے

تھے، چٹان کی طرح مضبوط دل تھا۔ اور اب میں اتنی سی دیر میں اُس بچے کی طرح رو رہا ہوں، جس کا کھلونا ٹوٹ گیا ہو۔

ایک لہر آتی ہے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر میں جا پھینکتی ہے، دوسری کنارے پر چھوڑ جاتی ہے، تیسری کنارے سے بہا کر پھر سمندر میں لے جاتی ہے، اور تھپیڑے سہنے کے لئے چھوڑ جاتی ہے۔

زندگی کتنی عجیب ہے؟

یا شاید میں ہی ایسا ہوں جسے نہ دل پر قابو ہے نہ جذبات پر۔ ذرا سی دیر میں بدل جاتا ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے متاثر ہو جاتا ہوں، میرا کوئی اصول ہی نہیں۔ شاید یہ میری اپنی کمزوریاں ہیں، میری اپنی خامیاں ہیں، یا یہ زندگی کی ان لہروں کا کھیل ہے۔

—— زندگی کا مدّ و جزر!